

عن إبراهيم بن ميسرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ((من وقر صاحب بدعة فقد أعان على هدم الإسلام.)) (رواه البيهقي في شعب الإيمان)

”جس شخص نے کسی شریعت سازی کرنے والے، یعنی دین میں اضافہ کرنے والے کی عزت و توقیر کی اس نے بلا شک اسلام (کی عمارت) کو ڈھا دینے میں (اس کی) اعانت کی۔“

## بدعت کی تباہ کاری

دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کی تعلیمات انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہیں۔ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اسلام کوئی نہ کوئی ہدایت اور رہنمائی نہ دیتا ہو، چنانچہ جب کوئی شخص اپنی زندگی میں خود ساختہ دین کے بعض احکام داخل کر لیتا ہے تو جس حد تک وہ احکام اس نے اپنی زندگی میں داخل کیے ہوتے ہیں اسی حد تک اس کی زندگی سے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین کے احکام خارج ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ خود ساختہ احکامِ دینی اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامِ دینی باہم مختلف اور متضاد ہوتے ہیں، اور دو باہم متضاد اشیاء کا ایک وقت ایک مقام پر مجتمع ہونا بلا شک و شبہ خلافِ دین و دانش اور خلافِ عقل و منطق ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ خود ساختہ دین کے احکام کو یکے بعد دیگرے اپنا شروع کر دیتا ہے تو وہ دین آہستہ آہستہ اس کی زندگی کی تمام وسعتوں پر چھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ حقیقی و اصلی دین اپنی جگہ پر سمٹنا شروع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے جب وہ سمٹتے سمٹتے اپنا بوریا بستر ہی سمیٹ لیتا اور اس کی زندگی سے بالکل ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آج کئی ایسے فرقے اور گروہ دنیا میں موجود ہیں جو کہلاتے تو اسلامی فرقے ہیں مگر ان کے افکار و نظریات اور اعمال و کردار کو دیکھا اور پرکھا جائے تو وہاں اصل اسلام کا شاہدہ تک نظر نہیں آتا کیونکہ وہ لوگ اپنی تمام تر زندگی خود ساختہ دین کے حوالے کرنے کے بعد حقیقی و اصلی دین کو اپنی زندگی سے دیس نکال دے چکے ہیں۔

دین سازی کا کام کرنے والے حضرات خود تو جانتے ہوتے ہیں کہ انھوں نے کہاں کہاں دین سازی کے ”جوہر“ دکھائے ہیں، کس کس مقام پر اپنی ”تخلیقی“ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور کس کس مسئلے کو دین کا لبادہ پہنا کر اسے دینی اور شرعی حیثیت دے چکے ہیں۔ مگر بعد میں آنے والی نسلیں دین سازی کی تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر ان لوگوں کے ”خود ساختہ دینی مسائل“ ہی کو حقیقی و اصلی دین سمجھ لیتی ہیں، انھی کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کرتی ہیں، انھی کی تعلیم دیتی ہیں اور انھی پر مر مٹنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔ (قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ)

## فہرست

جواہر پارے ❁

کلمہ طیبہ ❁

اداریہ ❁

درس قرآن ❁

درس حدیث ❁

احکام و مسائل ❁

تحقیق و تنقید ❁

تحقیق و تنقید ❁

عقائد و اعمال ❁

تذکرہ علمائے اہل حدیث ❁

شعر و ادب ❁

بدعت کی تباہ کاری

(قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ)

تفسیر سورہ یس..... (۲)

(مولانا ارشاد الحق اثری)

توفیق الباری

(حافظ محمد اشرف سعید)

ولد الزنا کی کفالت؟

(مولانا مفتی محمد عبید اللہ عقیف)

إعلاء السنن في الميزان

(مولانا ارشاد الحق اثری)

قادیانیوں نے حق قبول کرنے کے بجائے.....

(ابوصہیب محمد دادار شد)

کرسمس..... شرک کا تہوار

(حامد کمال الدین)

مولانا معین الدین کھوی رحمہ اللہ

(محمد اسحاق بھٹی)

..... اور کہتی ہے

(شورش کاشمیری)

2

4

6

8

11

14

17

20

## وگرنہ یہ سب کہانیاں ہیں

ساحل پر ہندو صلیب ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے جب لنگر انداز ہوا تو اس وقت ہندوستان پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی۔ صلیب تاجروں کے روپ میں داخل ہوا اور حکمرانوں کی عیش کو شیوں کی پرورش ہندوستان کے اٹلے خرید کر کرتا رہا۔ اور بغض ہلال میں سازشوں اور دسیسہ کاریوں سے اس نے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو بہکانا اور غلاماں اور پھسلانا شروع کر دیا نیز صلیب بڑی چابک دستی سے مختلف محادوں..... تعلیم، معاشرت، عقیدے..... پر اثر انداز ہونا شروع ہو گیا جس سے اس نے ہندوستانی معاشرت..... جس پر اسلامی معاشرت کا غلبہ تھا..... بایں انداز متاثر ہونا شروع ہو گئی کہ ہندوستان کی علمی زبان..... جو کہ فارسی تھی..... کو پس پشت ڈال دیا گیا، علم برائے علم و اصلاح کی بجائے علم برائے معاش کا نکتہ نظر متعارف کرایا گیا، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر کے ان کو اسی ادھیڑ بن میں الجھا دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ پس ماندہ علاقوں میں عیسائیت کے مبلغ پھیلا کر ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی مہم مشنریوں کا جال پھیلا کر شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی اس نے چند ضمیر فروشوں کو داد و دہش سے خریدنا شروع کر دیا۔ اس وقت مسلمان ایک طرف مذہب کے پلیٹ فارم پر پادریوں کے سامنے کھڑے ہو گئے انھوں نے پادریوں کے ساتھ علمی مکالمے و مناظرے کر کے ان کے دھوکہ و فریب اور ان کی سازشوں کو بے نقاب کرنا شروع کیا دوسری طرف چند اللہ والوں نے رب کی دھرتی پر رب کے نظام کا نعرہ لگا دیا مسلمانوں کے نزدیک چوں کہ اعلیٰ کلمۃ اللہ کی خشت اول ہی غیر ملکی استبداد کا اخراج تھا جس کے لیے انگریز دشمنی کی زیر زمین تحریک اس حکمت عملی سے شروع کی گئی کہ وہ انگریز فوج کی بعض پلاٹونوں تک بھی جا پہنچی چنانچہ جب فوج کی مختلف پلاٹونوں نے علم بغاوت بلند کر کے اس کا اظہار کر دیا اور بات دور تک پھیل گئی تو پھر صلیبی فوج نے کھلم کھلا مسلمان حکمرانوں یعنی مغلوں کی حکومت کو مفلوج مغل حکمرانوں کو معزول اور ہندوستان پر باقاعدہ قبضہ کر کے ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً نشانہ ستم بنانا شروع کر دیا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد چونکہ صلیب و ہلال آمنے سامنے ہو گئے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو صلیبی استعمار نے غدر کا نام دے دیا تو پھر ہندوستان کی دوسری اقوام بھی تحریک آزادی ہند میں شامل ہو گئیں۔ اس تحریک میں سب زیادہ جانیں بھی مسلمانوں کی قربان ہوئیں اور مالی نقصان بھی سب سے زیادہ مسلمانوں نے اٹھایا۔ جدوجہد آزادی کی کامیابی کے بعد صلیب چلا تو گیا لیکن یہ برصغیر جسے وہ سونے کی چڑیا کہتا تھا اس کے ذہن سے نہ نکل سکا۔ ہندوستانی مسلمانوں سے ہتھیائی ہوئی وسیع و عریض حکومت سے ان کو محروم کر دیا گیا اور مسلمانوں کو مزید دو حصوں میں تقسیم بھی کر دیا گیا، ۱۹۴۷ء میں تبادلہ آبادی کے بعد لاکھوں خصوصاً مشرقی پنجاب کے مسلمان تہہ و تیغ بھی ہوئے، ہزاروں عقیف دو شیرائیں سوراخیں کر بھی لے گئے اور ظالموں نے ہزاروں بچہ انیوں پر پردیے۔ صلیب کی ان ستم شعار یوں کے باوجود جب پاکستان خریطہ عالم پر ابھرا آیا تو خالص مسلمانوں کے اس ملک میں بھی صلیب نے سازشیں اپنے ٹوڈیوں کے ذریعہ جاری رکھیں بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینے کی آواز صلیب کی داد و دہش سے پلے ہوئے انھیں ذلہ خواروں اور چچوں کی آواز ہے وگرنہ جو خاندان لہو کے اس دریا سے گزر کر آئے ہیں وہ تو کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے۔

تحریک آزادی کی جدوجہد کے دنوں صلیب نے ایک سفید پوش قوم (یہ اصطلاح بقول ایک دانشور کے ان ٹوڈیوں کے لیے ایجاد ہوئی تھی جنہیں ہدایت تھی کہ وہ سفید کپڑے پہن کر انگریز دفاتر میں جائیں تب انہیں کرسیوں یا بچوں پر انہیں بیٹھنے کی اجازت ہوگی)، کی بھی اس نے پرورش کی اس دور کے سفید پوش برطانیہ کے نسل در نسل اس قدر مطیع اور غلام تھے کہ گذشتہ دور حکومت میں ملکہ برطانیہ نے جب پاکستان کا دورہ کیا تو ان کی آل اولاد میں سے بعض اس وقت بھی خود کو برطانیہ کی رعایا تسلیم کیا اور ملکہ برطانیہ کو اپنی اطاعت گزاری اور وفا شعار کی یقین دلایا، چنانچہ قیام پاکستان کے بعد سے صلیب نے پاکستان کی



عنانِ حکم رانی انھیں سفید پوش خاندانوں کے ہاتھوں میں دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ٹوڈیوں کی فطرت چوں کہ سورج کبھی جیسی ہوتی ہے اور سیاست کی منڈیروں پر بیٹھے یہ وہ پرندے ہوتے ہیں کہ انہیں جس ڈیرے پر بھی دانہ نظر آئے یہ پھدک کر اسی ڈیرے پر سرنگوں ہی نہیں ہو جاتے بلکہ خود سپردگی کے لیے بھی ہمہ وقت آمادہ رہتے ہیں بعض خاندان ”ماشاء اللہ“ اس قدر ”دانا“ ہوتے ہیں کہ ان کے خاندان کو دن و نڈ وہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک ہی خاندان میں تمام سیاسی جماعتوں اور اداروں کی نمائندگی موجود ہوتی ہے اگر خاندان کی تنگ دامانی سیاسی تنوع کی متحمل نہ ہو تو آپس کا سدھی پن اس کا ازالہ کر دیتا ہے حال میں تحریک انصاف کے ڈیرے پر دانہ چکنے والوں کا جم غفیر اس کا تازہ ترین خیرہ کن اور خوب صورت مشاہدہ خاصے کی چیز ہے۔

دوسری اہم ترین وجہ صرف ہماری ہی نہیں پوری مسلم امہ کی بد قسمتی ہے کہ وہ بالفرض اگر کفار کے زرخے میں نہیں بھی تو کفار کی چکنی چڑی باتوں میں آکر ان کو اپنے اہم راز دیتے اور ان پر اندھا اعتماد کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں وطن عزیز کی اصلاح کے یہی نکتے ہیں کہ حکم الہی کے تحت ہم اقتدار کے لیے اہلیت و صلاحیت کو لازمہ بنائیں، صلیب یعنی دنیا بھر کی کسی بھی عیسائی حکومت یا حکم ران کو اپنا خیر خواہ نہ جانیں، نیز ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق کسی یہودی و عیسائی کو اپنا راز دار نہ بنائیں، مسلمان حکم ران مل بیٹھ کر ایثار و قربانی کا مظاہرہ کریں، مسلمان حکم ران تعلقات کی بنیاد اسلام کو بنائیں، آپس میں سازشوں سے مکمل اجتناب کریں اور گلے شکوے، شکایتیں ایک دوسرے سے مل کر کریں اور سنیں اور مسلمان ممالک کو اللہ تعالیٰ نے جن جن نعمتوں سے نوازا رکھا ہے ان سے اپنے مسلمان بھائیوں کو ترجیحاً فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں مسلمان حکمرانوں کو بھی اغیار کے سامنے دست سوال دراز نہ کریں کیوں کہ ایسا رزق ہی پرواز میں کوتاہی کا سبب بن جاتا ہے اپنے مسلمان بھائیوں سے ضرورتوں کا اظہار کریں، ان کے محنت مشوروں پر عمل اور حکومتی اخراجات میں قناعت کر کے اپنے عوام کی بنیادی ضروریات پر خرچ کرنے کو ترجیح دیں اور یورپی آداب حکمرانی (Protocol) کی بجائے اسلامی آداب حکمرانی کو یوں ملحوظ رکھیں کہ جس میں احساس ذمہ داری بھی نظر آئے اور آخرت کا فکر جواب دہی بھی محسوس ہو کہ ہم نے بارگاہ الہی میں پیش ہو کر اپنے اعمال کا کچا چٹھالے کر جانا ہے۔ حسب عہدہ یا حسب ذمہ داری اسلام نے ہر مسلمان کو یہی سبق دیا ہے کہ وہ رعیت..... یعنی ماتحت اور زیر نگرانی افراد..... کا مسئول یعنی جواب دہ ہے۔ جو سیاست دان اس نکتہ کو لے کر تخت اقتدار پر آئے گا اس سے تو کچھ خیر کی امید ہو سکتی ہے ورنہ یہ سب کہانیاں ہیں سنتا جا اور تملتا جا۔

## استدراک:

گذشتہ ہفتے مولانا معین الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت کی تنظیمی و سیاسی خدمات کا تذکرہ کیا یہ تو قارئین کے علم میں یقیناً ہوگا کہ مولانا معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کو مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کی تاسیس ہی سے ہی مرکزی جمعیت اہل حدیث کی کامینہ نے مجلس عاملہ کا رکن نامزد کر لیا تھا۔ ۶۹ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث روزہ الاعتصام پر ایک پر آشوب دور آیا تھا اس دور کے بعض معاملات میں بعض اکابرین اور اعیان جماعت نے ان کو فیصل بنایا تھا اس دور کی اکثر مصالحتی مجالس جس میں مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف، حاجی محمد اسحاق حنیف، چوہدری عبدالقادر علیک (آف ساہیوال)، میاں عبدالعزیز، حافظ محبوب عالم، مولانا عبدالکریم ایڈووکیٹ (لاہور) رحمۃ اللہ علیہ شریک مشورہ ہوتے تھے ان کی خدمت گزاری کے لیے موجود ہونے کی وجہ سے راقم نے مولانا لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کی معاملہ فہمی ”باہمی احترام و اکرام مولانا کی دوراندیشی، لگی لپٹی کے بغیر احقاق حق و ابطال باطل کے حسن اظہار کا معنی شاہد اور سامع تھا۔ پھر بعد میں مولانا ۱۵ سال تک مرکزی جمعیت کے امیر بھی رہے۔ سیاسی جماعتوں کی طرز پر مرکزی جمعیت اہل حدیث کو چلاتے ہوئے انتظامی لحاظ سے کئی نازک مقام بھی آئے لیکن ان طوفانوں جھکڑوں سے مولانا مقادرات سے اپنا دامن ہمیشہ بچا کر نکلنے میں کامیاب ہی رہے۔ اسی طرح مولانا نے اپنے حلقے میں سیاست بھی احترام و وقار کے ساتھ ہی کی۔ اور ہمارے علم کے مطابق مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرائض و فوافل اور معمولات اذکار و وظائف پر کبھی امور دنیا کو مقدم نہ کیا۔

اللھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه وادخله الجنة الفر دوس۔ آمین

# تفسیر سورہ تیس

مولانا ارشاد الحق اثری رحمہ اللہ

آسانی فرمادیتے ہیں۔“ (ابن مردویہ، دیلمی)  
یہ روایت امام ابو نعیم نے ”اخبار اصہبان“ (۱/۱۸۸) میں بھی ذکر کی ہے مگر اس کا راوی مروان بن سالم سخت ”ضعیف“ ہے۔ امام احمد اور امام نسائی نے ”لیس بثقة“ اور امام ساجی اور ابو عمرو بہ الحارانی نے ”یضع الحديث“ (وہ حدیثیں وضع کرتا تھا) کہا ہے۔  
دیلمی میں بھی اسی سند سے یہ روایت ہے مگر اس میں ”عن أبي الدرداء وأبي ذر“ ہے، گویا اسے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ (إرواء الغلیل: ۱۵۲/۳)  
(۱۵) حضرت معقل بن یسار سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تیس قرآن کا دل ہے۔ جو اسے اللہ کی رضا اور آخرت کے لیے پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے پہلے گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ تیس فوت ہونے والوں پر پڑھو۔“  
(أبو دود: ۳۱۲۱، أحمد: ۵/۲۶، ابن ماجہ: ۱۴۴۸ وغیرہم)

مگر یہ روایت بوجہ صحیح نہیں:

۱۔ اس کا ایک راوی ابو عثمان ہے، جو ”النهدي“ نہیں ہے۔ سلیمان تبی اس سے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ امام علی بن مدینی نے اسے ”مجهول“ اور حافظ ذہبی نے ”لا يعرف“ کہا ہے۔

(تہذیب: ۱۶۳/۱۲، میزان: ۵۵۰/۴)

تہا امام ابن حبان نے ”الثقات“ (۳۲۶/۲) میں اسے ذکر کیا ہے مگر ایسے مجہول راویوں کو تہا ان کا ”الثقات“ میں ذکر کرنا اہل علم کے ہاں قابل اعتبار نہیں، جیسا کہ لسان المیزان کے مقدمہ (۱۴/۱)

(۱۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:  
”جو ہر رات تیس پڑھنے پر مداومت کرتا ہے وہ شہید فوت ہوگا۔“ (طبرانی، بزار)

علامہ سیوطی نے الدر المنثور میں اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔ اس کی سند سخت ضعیف ہے کیونکہ اس کا راوی سعید بن موسیٰ ازدی ”کذاب“ ہے۔ (مجمع الزوائد: ۹۷/۷)  
امام ابن حبان نے اسے حدیثیں گھڑنے والا قرار دیا ہے۔ (میزان: ۱۵۹/۲)

علامہ سیوطی نے اسے ذیل الأحادیث الموضوعة (ص: ۲۴) میں ذکر کیا ہے، نیز دیکھیے: الضعيفة، رقم: ۶۸۴۴۔

(۱۲) امام عطاء بن ابی رباح بلاغاً روایت کرتے ہیں کہ جس نے دن کے ابتدا میں تیس پڑھی اس کی حاجات پوری کر دی جائیں گی۔ (دارمی)

یہ بلاغاً یعنی مرسل ہے، البتہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(۱۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:  
”جو شخص تیس صبح کے وقت پڑھے گا اس دن شام تک اسے آسانی ملے گی اور جو رات کی ابتدا میں پڑھے گا اسے اس رات صبح تک آسانی ملے گی۔“ (دارمی)

یہ موقوفاً ہے، البتہ اس کی سند حسن ہے اور حکماً مرفوع ہے۔

(۱۴) حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس مرنے والے کے پاس تیس پڑھی جائے اللہ اس پر

دل ہوتا ہے، قرآن کا دل تیس ہے۔“

(شعب الایمان: ۴۸۲/۲)

امام بیہقی نے فرمایا ہے:

”ابو قلابہ کبارتا بعین میں سے ہیں۔ اگر ان سے یہ صحیح ہے تو یہ انھوں نے بلاغاً کہا ہے۔“

مگر یہ صحیح نہیں۔ خلیل بن مرة راوی ضعیف ہے۔

(تقریب، ص: ۹۴)

(۱۷) حضرت محمد بن علی ابو جعفر فرماتے ہیں:

”جو اپنے دل میں سختی پائے وہ پیالے میں زعفران سے تیس لکھ کر پی لے۔“ (حاکم، شعب الایمان: ۴۸۲/۲،

نوادر الأصول: ۸۸/۶)

امام بیہقی نے فرمایا ہے کہ اس کی صحت میں نظر ہے۔ عرض ہے کہ اس کا راوی عمرو بن ثابت بن ابی المقدام ”ضعیف“ ہے۔ (تقریب، ص: ۲۵۷) اس لیے یہ بھی قابل استدلال نہیں۔

(۱۸) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ایک روایت ہے کہ جو جمعہ کے روز اپنے والدین یا دونوں میں سے کسی ایک کی قبر کی زیارت کرتا ہے اور ان کے پاس تیس پڑھتا ہے، ہر حرف کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمادے گا۔ (ابن النجار، الدر المنثور، ابن عدی، أخبار أصبہان)

امام ابن عدی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔ امام دارقطنی وغیرہ نے اس کے راوی عمرو بن زیاد کو ”وضاع“ قرار دیا ہے۔ علامہ ابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔

علامہ سیوطی نے اسے سہارا دینے کی جو بلا جواز کوشش کی ہے اس کی دلچسپ تفصیل الضعیفہ (رقم: ۵۰) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۱۹) امام ابو نصر سبزی نے ”الإبانة“ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(باقی صفحہ نمبر ۱۰ پر)

میں حافظ ابن حجر نے وضاحت کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی تقریب (ص: ۳۱۷) میں اسے ”مقبول“ ہی کہا ہے۔ اور تقریب کے مقدمے میں انھوں نے صراحت کر دی ہے کہ مقبول تبھی ہوگا جب اس کی متابعت ہو، ورنہ وہ ”لین الحدیث“ ہوگا۔ اور ابو عثمان کی متابعت ثابت نہیں۔

۲۔ ابو عثمان اسے اپنے باپ سے روایت کرتا ہے اور وہ بھی مجہول ہے۔

۳۔ ابو عثمان اسے کبھی اپنے باپ سے اور کبھی حضرت معقل سے بلا واسطہ بیان کرتا ہے، اور کبھی اسے موقوفاً بیان کرتا ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

”أعله ابن القطان بالاضطراب، وبالوقف، وبجهالة حال أبي عثمان وأبيه. ونقل أبو بكر بن العربي عن الدار قطني أنه قال: هذا حديث ضعيف الإسناد، مجهول المتن، ولا يصح في الباب حديث.“ (التلخيص: ۱۰۴/۲)

”ابن قتان نے اسے اضطراب، وقف اور ابو عثمان اور اس کے باپ کی جہالت کی وجہ سے معلول کہا ہے۔ ابن عربی نے امام دارقطنی سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث سنداً ضعیف، متناً مجہول ہے اور اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔“ علامہ البانی نے بھی ارواء الغلیل (۱۵۰/۳) میں اسے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔

(۱۶) ابو قلابہ فرماتے ہیں:

”جس نے تیس کو پڑھا اسے بخش دیا جائے گا۔ جو کھانے کی کمی کے خوف سے تیس پڑھے اسے وہ کھانا کافی ہوگا۔ جس نے اسے میت کے پاس پڑھا اس پر آسانی ہو جائے گی۔ جس عورت کے ہاں ولادت میں مشکل آئے اس کے پاس اسے پڑھا جائے تو اس عورت پر آسانی ہو جائیگی۔ جس نے تیس کو پڑھا اس نے گویا گیارہ مرتبہ قرآن پڑھا۔ ہر چیز کا

# توفیق الباری

”الادب المفرد“ للبخاری کا اردو ترجمہ مع تشریحات و فوائد

از حضرت نواب سید صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ  
تسہیل: حافظ محمد اشرف سعید (نیوکروں شالامار باغ۔ لاہور)

باب: أما بعد

أما بعدُ کہاں لکھا جائے

۱۱۵۳ . عن زيد بن أسلم قال: أرسلني أبي إلى ابن عمر، فرأيتُه يكتب: بسم الله الرحمن الرحيم، أما بعد . (صحيح الإسناد)  
”حضرت زید بن اسلم بیان کرتے ہیں کہ میرے والد نے مجھے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف بھیجا تو میں نے انھیں اس طرح لکھتے ہوئے دیکھا: بسم الله الرحمن الرحيم، اما بعد“

۱۱۵۴ . عن هشام بن عروة قال: رأيت رسائل من رسائل النبي ﷺ كلما انقضت قصة قال: ((أما بعد)). (صحيح)

”حضرت ہشام بن عروہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے کئی خطوط دیکھے ہیں۔ جہاں کوئی بات ختم ہوتی ہے وہاں ”اما بعد“ لکھا ہوتا۔“

باب: صدر الرسائل بسم الله الرحمن الرحيم

۱۱۵۵ . عن كبراء آل زيد بن ثابت، أن زيد بن ثابت كتب بهذه الرسالة: بسم الله الرحمن الرحيم . لعبد الله معاوية أمير المؤمنين من زيد بن ثابت، سلام عليك أمير المؤمنين ورحمة الله! فإني أحمد إليك الله الذي لا إله إلا هو، أما بعد . (حسن الإسناد)

”حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے خاندان کے بزرگوں سے

روایت ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف ایک خط اس طرح تحریر کیا تھا: بسم الله الرحمن الرحيم۔ اللہ کے بندے امیر المؤمنین کے لیے زید بن ثابت کی طرف سے۔ امیر المؤمنین! آپ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت ہو۔ میں اللہ تعالیٰ کی حمد کا تحفہ آپ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں، اما بعد۔“

۱۱۵۶ . قال أبو مسعود الجريري: سأل رجل الحسن قراءة بسم الله الرحمن الرحيم، قال: تلك صدور الرسائل .

(صحيح الإسناد)

”ابو مسعود جریری بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت حسن سے بسم الله الرحمن الرحيم کی قراءت کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: جہاں پڑھنے کا حکم ہے وہاں پڑھو اور یہ خطوط کے شروع میں لکھنے کے لیے بھی ہے۔“

باب: بمن يبدأ في الكتابة؟

خط میں ابتدا کس سے کی جائے؟

۱۱۵۷ . عن نافع قال: كانت لابن عمر حاجة إلى معاوية فأراد أن يكتب إليه، فقالوا: ابدأ به . فلم يزالوا به حتى كتب: بسم الله الرحمن الرحيم إلى معاوية . (صحيح الإسناد)

”حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما



سے۔ امیر المؤمنین! آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام اور رحمت ہو۔ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اما بعد۔“

۱۱۶۱۔ قال أبو هريرة: قال النبي ﷺ: ((إن رجلاً من بني إسرائيل - وذكر الحديث - وكتب إليه صاحبه: من فلان إلى فلان.))

(ضعیف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”بنی اسرائیل کے ایک شخص نے اپنے ساتھی کو خط لکھا: فلاں کی طرف سے فلاں کی طرف۔“

**فائدہ:** حضرت کے رسائل و خطوط بنام ملوک وغیرہ اسی عنوان سے ہوتے تھے اور صحابہ سے الی فلاں بن فلاں بھی ثابت ہے۔ معلوم ہوا کہ اس امر میں توسیع ہے، جس طرح چاہے لکھے اور ابتدا بسملہ و حمد سے کرے، پھر ”اما بعد“ لکھ کر مطلب لکھے۔ خطوط میں ذکر کتابتِ حمد خدا کا آیا ہے لیکن تحریر کرنا نعت وغیرہ ثابت نہیں ہے۔



### حیات لکھوی

حضرت مولانا معین الدین لکھوی رحمہ اللہ کے بارے میں ایک کتاب ”حیات لکھوی“ مرتب کی جا رہی ہے۔ جن حضرات کو جو بھی معلومات ہوں، مثلاً:

تقاریر، تصاویر، سیاسی و معاشرتی، مشاہدات، واقعات اولین فرصت میں ارسال فرمائیں۔

مرحوم کے شاگرد، معتقدین، مریدین اپنی نگارشات اور تاثرات پتہ ذیل پر پہنچائیں۔

محمد موسیٰ ایم اے، بی ایڈ۔ 32 ایکس گلی نمبر 1، گورنمنٹ کالونی، اوکاڑہ۔ فون: 0345-7496925



کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کوئی کام تھا تو انھوں نے ان کو خط لکھنے کا ارادہ فرمایا۔ لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام سے شروع کرو۔ لوگ برابر یہی کہتے رہے مگر انھوں نے یوں لکھا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ معاویہ کی طرف۔“

۱۱۵۸۔ عن أنس بن سيرين قال: كتبت لابن عمر فقال: اكتب: بسم الله الرحمن الرحيم، أما بعد، إلى فلان. (صحيح الإسناد)

”حضرت انس بن سیرین بیان کرتے ہیں: میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر خط لکھا تو انھوں نے کہا: یوں لکھو: بسم اللہ الرحمن الرحیم، اما بعد۔ فلاں کی طرف۔“

۱۱۵۹۔ عن أنس بن سيرين قال: كتب رجل بين يدي ابن عمر: بسم الله الرحمن الرحيم لفلان، فنهاه ابن عمر فقال: قل: بسم الله، هو له. (صحيح الإسناد)

”حضرت انس بن سیرین سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے خط لکھا: بسم اللہ الرحمن الرحیم، فلاں کے لیے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے منع کیا اور فرمایا: بسم اللہ لکھو، اس کے بعد ”ہو“ (وہ، یعنی خط کی طرف اشارہ ہے) لکھ کر اس کا نام لکھو جس کی طرف بھیج رہے ہو۔“

۱۱۶۰۔ عن كبراء آل زيد، أن زيدا كتب بهذه الرسالة: لعبد الله معاوية أمير المؤمنين، من زيد بن ثابت: سلام عليك أمير المؤمنين ورحمة الله! فإني أحمد الله إليك الله الذي لا إله إلا هو، أما بعد. (حسن الإسناد)

”حضرت زید کے خاندان کے ایک بزرگ نے بیان کیا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ایک خط اس طرح لکھا: اللہ کے بندے امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف

## ولد الزنا کی کفالت؟

مولانا مفتی محمد عبید اللہ عقیف رحمۃ اللہ علیہ (بانی مسجد اہل حدیث، رحمت ٹاؤن، فیصل آباد)

﴿وَلَا تَعْزَمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ط﴾

[البقرة: ۲۳۵]

”نکاح کی گرہ باندھنے کا قصد مت کرو جب تک عدت گزر نہ جائے۔“

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں ارقام فرماتے ہیں:

”قال ابن عباس ومجاهد والشعبي وقتادة والربيع بن أنس وأبو مالك وزيد بن أسلم ومقاتل بن حيان والزهري وعطاء الخراساني والسدي والثوري والضحاك: ﴿حتى يبلغ الكتاب أجله﴾ يعني ولا تعقدوا العقد بالنكاح حتى تنقضي العدة.“

”حضرت ابن عباس، مجاہد، عامر شعی، قتادہ، ربیع بن انس، ابو مالک، زید بن اسلم، مقاتل بن حیان، زہری، عطاء خراسانی، ثوری اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم حتیٰ یبلغ الكتاب اجله کی تفسیر میں یہی کہتے ہیں کہ نکاح کی گرہ نہ باندھو حتیٰ کہ عدت گزر جائے۔“

امام موصوف مزید وضاحت کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

”وقد أجمع العلماء على أنه لا يصح العقد في مدة العدة . واختلفوا فيمن تزوج امرأة في عدتها فدخل بها فإنه يفرق بينهما وهل تحرم عليه أبداً؟ ..... إلخ“ (تفسير ابن كثير: ۱/۲۸۷)

**سوال:** کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں (محمد نعیم ولد حاجی محمد نذیر، ساکن کوٹ کمبوه) اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ آج سے تقریباً چودہ سال قبل مسماۃ فرزانہ دختر لیاقت علی ساکن مناواں سے میرا نکاح ہوا۔ نکاح کے بعد جب وہ میرے گھر آئی تو پہلی رات ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ پہلے سے حاملہ ہے۔ اسی وقت ہمارا تنازعہ ہو گیا اور میں نے اسی وجہ سے اس سے ہم بستری نہیں کی اور ہمارا یہ تنازعہ چلتا رہا جس کا میرے والدین اور لڑکی کے والدین کو علم ہے اور نکاح کے چھ ماہ بعد اس نے بچے کو جنم دیا اور اس دوران میں نے اس سے ایک دفعہ بھی ہم بستری نہیں کی۔ آخر کار فریقین کے اتفاق سے طلاق کا معاملہ طے پا گیا۔ جولین دین کرنا تھا وہ کر کے ہم فارغ ہو گئے۔ وہ بچہ چونکہ میرا تھا ہی نہیں اسی لیے وہ بچہ اس عورت کو دے دیا گیا۔ اب چودہ سال بعد وہ خرچے کا تقاضا کرنے لگی ہے، لہذا شریعت کی رو سے میری راہنمائی کی جائے کیا مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں اس بچے کی کفالت کا ذمہ دار ہوں یا نہیں؟

**جواب:** بعون اللہ الوہاب ومنہ الصدق والصواب: اگر سوال اصل حقیقت واقعہ کے عین مطابق ہے تو واضح ہو کہ یہ نکاح بدلائل ذیل باطل ہے یعنی سرے سے منعقد ہی نہیں ہوا:

۱۔ اس لیے کہ یہ نکاح عدت کے اندر کیا گیا ہے اور بحکم فرمان باری تعالیٰ عدت کے اندر کیا گیا نکاح باطل ہے جیسا قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

گیا لہذا یہ نکاح بھی باطل اور غیر شرعی ہے، مزید تائید کے لیے ملاحظہ فرمائیے:

عن رويفع بن ثابت عن النبي ﷺ قال: ((من يؤمن بالله واليوم الآخر لا يسقي مائه ولد غيره.)) هذا حديث حسن والعمل على هذا عند أهل العلم.

تحفة الأحوذی، باب الرجل يشتري الجارية وهي حامل: ۱۹۱/۲ وفي رواية أبي داود: ((لا يسقي زرع غيره.)) یعنی إتيان الحبالی.

(عون المعبود: ۲/۲۱۴)

حضرت رويفع بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ پرائے لڑکے کو اپنا پانی یعنی نطفہ نہ پلائے۔“ اور ابوداؤد میں ہے ”وہ پرانی کھیتی کو پانی نہ پلائے“، یعنی غیر کی حاملہ سے وٹی نہ کرے۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ حاملہ عورت سے بحالت حمل نکاح صحیح نہیں ہوتا یعنی سرے سے منع ہی نہیں ہوتا۔

شیخ المحمد ثین حضرت مولانا ابوسعید شرف الدین محدث دہلوی صاحب تنقیح الرواة شرح مشکوٰۃ کا فتویٰ:

آپ زنا سے حاملہ عورت کے ساتھ نکاح کے متعلق ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

”اُس (زنا سے حاملہ عورت کے ساتھ نکاح کے جواز وعدم جواز) کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ خود زانی سے نکاح ہو، دوسری یہ کہ غیر زانی سے نکاح ہو۔ صورت ثانیہ (یعنی غیر زانی سے نکاح) میں علت منع (أن يسقي مائه زرع غيره) پائی جاتی ہے، اولیٰ میں نہیں۔ پس صورت اولیٰ میں جواز ہو سکتا ہے، ثانیہ میں نہیں۔ پس جب علت منع پائی گئی تو

”علماء اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ عدت کی مدت کے اندر عقد نکاح صحیح نہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص عدت کے اندر نکاح کر کے جماع کر لے تو باوجود جماع کے ان میں جدائی کرانی ہوگی۔ اختلاف اس میں ہے کہ وہ عدت کے بعد از سر نو نکاح کر سکتا ہے یا نہیں۔“

جمہور استبراء رحم کے بعد جواز کے قائل ہیں مگر امام مالک فرماتے ہیں کہ وہ عورت اس شخص پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ چونکہ سوالنامے کی تصریح کے مطابق یہ نکاح عدت کے اندر ہوا ہے، لہذا یہ نکاح شرعاً باطل ہے کیونکہ جس طرح مطلقہ حاملہ یا متوفی عنہا زوجہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے، اسی طرح حاملہ بزنا کی عدت بھی وضع حمل ہے جیسا کہ آیت ﴿واولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن﴾ [الطلاق: ۴] کے عموم سے امام سیوطی نے یہ استدلال کیا ہے کہ جس طرح اس آیت سے متوفی عنہا زوجہ اور مطلقہ حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے اسی طرح اس کا عموم حاملہ بزنا کی عدت وضع حمل کو بھی اپنے ضمن میں لا رہا ہے جیسا کہ درمنثور اور نواب صاحب صدیق حسن خان کی کتاب مسک الختام مرقوم ہے، ملاحظہ ہو فتاویٰ ثنائیہ: ۲/۱۷۷

امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”قال أبو حنيفة: تعتد بوضعه ولو كان من زنا لعموم الآية.“ (نبیل الأوطار، باب تعتد المتوفی عنہا بوضع الحمل: ۶/۲۹۰)

”امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اس آیت ﴿واولات الاحمال.... إلخ﴾ کے عموم کے مطابق زنا سے حاملہ عورت کی عدت بھی وضع حمل ہے۔“

لہذا جب اس آیت کے عموم کے مطابق زنا سے حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے اور عدت کے اندر کیا گیا نکاح شرعاً باطل ہے۔ پس صورت مسئلہ سے زنا سے حاملہ عورت سے بحالت حمل نکاح کیا

صورت مذکورہ (ثانیہ) میں نکاح نہ ہوا، لہذا طلاق کی ضرورت نہیں۔

”نعم، فإن دخل بها فلها المهر بما استحله من فرجها كما يدل عليه حديث الترمذي وأبي داود وغيرهما في حديث عائشة في النكاح بغير ولي.“ (تحفة الأحمدي: ۱۷۶/۲ وفتاویٰ ثنائیہ: ۱۷۴/۲ وعون المعبود: ۲۴۵/۲)

لہذا ان آیات واحادیث حسنہ مسطور بالا اور حضرت شیخ الحدیث کے فتوے کے مطابق صورت مسئلہ میں نکاح ہی نہیں ہوا اور پھر سائل محمد نعیم کا کہنا ہے کہ اس نے عورت سے جماع نہیں کیا اور مسماۃ فرزانہ نے اس باطل نکاح کے چھ ماہ بعد حرامی بچے کو جنم دیا تو ایسے میں یعنی جماع نہ ہونے کی وجہ سے اسے مہر بھی شرعاً نہیں ملتا۔ اور طلاق کی بھی ضرورت نہیں، یعنی وہ بیوی بنی ہی نہیں، لہذا اُس بچے کا محمد نعیم کے ساتھ ادنیٰ سانسبی تعلق بھی تعلق نہیں بنتا۔ لہذا اُس بچے کے خرچے کا تقاضا اور مطالبہ شرع کے سراسر مخالف ہے۔ اور محض سینہ زوری ہے۔ اور اکل بالباطل کی غلط کوشش ہے۔ بشرط صحت سوال محمد نعیم اس بچے کی کفالت کا شرعاً ذمہ دار نہیں۔ یہ فتویٰ بشرط صحت تحریر کیا گیا ہے۔ مفتی کسی قانونی سقم کا ہرگز مسئول نہ ہوگا۔

هذا ما عندي والله تعالى أعلم بالصواب  
وإليه المرجع والمآب في يوم الحساب.

### بقیہ: تفسیر سورۃ یس

”قرآن میں ایک سورت ہے جسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ”العظیمۃ“ کہا جاتا ہے۔ اس کو پڑھنے والا اللہ تعالیٰ کے ہاں ”الشریف“ ہے۔ اسے پڑھنے والا قیامت کے روز قبیلہ ربیعہ و مضر کے لوگوں سے زیادہ افراد کی شفاعت کرے گا۔ اور وہ سورت یس ہے۔“

علامہ سیوطی نے الدر المنثور (۲۵۷/۵) میں کہا ہے: امام ابو نصر سجزی نے اسے ”حسن“ قرار دیا ہے۔ تتبع بسیار کے باوجود اس کی سند نہیں ملی۔<sup>(۱)</sup> واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

(۲۰) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مسند بزار (۸۷/۳) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میں پسند کرتا ہوں کہ میری امت کے ہر فرد کو سورۃ یس یاد ہو۔“

مگر یہ روایت ابراہیم بن حکم بن ابان کی وجہ سے ضعیف ہے۔ بلکہ طبرانی (رقم: ۱۱۶۱۶) میں اسی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی الفاظ سورۃ الملک کے بارے میں ہیں، نیز دیکھیے: مجمع الزوائد (۱۲۷/۷)

(۱) یہ روایت حکیم ترمذی نے نوادر الأصول (رقم: ۱۳۶۱) میں ذکر کی ہے اور اس میں سورت کا نام ”العظیمۃ“ کی بجائے ”العزیزۃ“ مذکور ہے۔ لیکن یہ روایت سخت ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں اصرم بن حوشب انتہائی ضعیف راوی ہے۔ عثمان داری کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین سے کہا: کیا آپ اصرم بن حوشب کو جانتے ہیں؟ وہ فرمانے لگے: ”وہ انتہائی جھوٹا اور خبیث شخص ہے۔“ (تاریخ ابن معین، رقم: ۱۶۸) امام بخاری، امام مسلم اور امام نسائی نے اسے ”متروک“ کہا ہے۔ (لسان المیزان: ۲۷۲/۱) اس کے علاوہ اس کی سند میں بقیہ بن ولید مدلس، معتمر بن اشرف مجہول ہے، مزید برآں یہ مرسل بھی ہے۔ اور حکیم ترمذی کے شیخ، جو ان کے والد ہیں، کا ترجمہ بھی نہیں ملا۔

تنبیہ: نوادر میں ”اصرم“ کے بجائے ”اخرم“ ہے جو صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس روایت کو امام قرطبی نے بھی نوادر الاصول کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور اس کی سند میں راوی کا نام ”اصرم“ ہی نقل کیا ہے۔ (الجامع لأحكام القرآن: ۴۰۵/۱۷) واللہ أعلم بالصواب۔ (ح-ح-ن)

# إعلاء السنن في الميزان

## حنفی مسلک کی معروف کتاب پر ایک نظر

مولانا ارشاد الحق اثری رحمۃ اللہ علیہ ادارہ علوم اثریہ، فیصل آباد

”إعلاء السنن في الميزان“ مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ ویرعاه کے قلم گوہر بار کا ایک تازہ شاہکار ہے۔ اس کتاب میں ہمارے ممدوح محترم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا ہے کہ جہاں کہیں بھی کتاب و سنت، سلف صالحین اور محدثین پر نازیبا حملے کیے جائیں گے وہاں ان کا قلم یقین و یساری کی پروا کیے بغیر حق و صداقت کی نمائندگی کرتا رہے گا۔

پیش نظر مضمون درحقیقت مذکور الصدر کتاب کا پیش رس بعنوان حرنے چند، اور مقدمہ ہے۔ کتاب ابھی طباعت کے مراحل میں ہے اور عنقریب منصفہ شہود پر آجائے گی۔ کتاب کس قدر اہمیت کی حامل ہے، اس کا بخوبی اندازہ شامل اشاعت تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔ کتاب میں مروجہ طریقے سے ہٹ کر خالص محققانہ انداز اور محدثانہ شان میں ایسے ایسے مباحث رقم کیے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر بے اختیار مولانا موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے لیے بصمیم قلب دعائے کلمات نکلتے ہیں۔ مولانا اثری رحمۃ اللہ علیہ نے ازراہ شفقت اور الاعتصام کے ساتھ دیرینہ تعلقات کی وجہ سے ہمیں یہ مقدمہ ارسال فرمایا ہے۔ اس پر ہم ان کے مشکور ہیں۔ اللہ انھیں ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

نوٹ: پیش نظر شمارے میں ”حرنے چند“ کو شامل کیا گیا ہے اور آئندہ شمارے میں کتاب کا مقدمہ شامل اشاعت ہوگا۔ ان شاء اللہ (ح۔ج۔ن)

ہوئی تب بھی بلا امتیاز تمام نے ان کتابوں کو اپنا مرجع و ماخذ سمجھا اور اپنے اپنے امام کے اجتہاد کو مؤید کرنے کے لیے ان پر اعتماد کیا۔ مگر کچھ عرصے سے ہمارے حنفی علماء کو محسوس ہونے لگا کہ ان کتابوں میں ہمارے مذہب کے دلائل بہت کم ہیں بلکہ یہ شوشہ بھی چھوڑا گیا کہ ان ائمہ محدثین کی کتابوں میں ان کے فقہی رجحانات کا اثر ہے۔ حتیٰ کہ بعض نے تو اس فکر کو ”کلمہ ذہبیہ“ قرار دے ڈالا۔

حالانکہ یہ احساس محرومی اور ائمہ محدثین کے بارے میں یہ تاثر کسی مالکی، شافعی یا حنبلی کا نہیں بلکہ ایک حنفی بزرگ کا ہے۔ ان کے نشانے پر ائمہ کرام اور بالخصوص اس طائفہ مقدسہ کے گل سرسبد اور مجتہد حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اس بات کا اعتراف ”شوشہ“ چھوڑنے والے بزرگ کو بھی ہے کہ ان کے مذہب و موقف کی بنیاد کسی امام کا قول نہیں بلکہ حدیث ہے اور وہ بھی صحیح حدیث۔ حیثما دار

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله، أما بعد:

دین اسلام کی بنیاد قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر ہے، اور قرآن مجید کی طرح احادیث بھی تمام امت مسلمہ کی مشترکہ میراث ہیں۔ قرآن مجید مابین الدفتین ہے اور عموماً ایک جلد میں زیور طبع سے آراستہ ہوتا ہے مگر کتب احادیث کا ذخیرہ بڑا وسیع ہے جو جوامع، سنن، مسانید، معاجم، مصنفات، مستدرکات، مستخرجات، السنن، الشمائل، الفوائد اور اجزاء وغیرہ کے مختلف ناموں سے معروف ہیں۔ ان میں سے جن کتابوں کو زیادہ شہرت ملی اور علمائے امت کے ہاں جنہیں زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی، وہ ہیں: موطأ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، نسائی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، الدارمی، مسند احمد اور کتب صحاح۔

ہر دور میں بلا امتیاز ان کتابوں سے علمائے امت نے استفادہ کیا۔ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی نسبتوں میں جب امت کی تفریق و تقسیم



مذہب میں ایسے مسائل ہیں کہ احادیث و آثار ان کے مخالف ہیں، چنانچہ انھوں نے جملہ احادیث نبوی، آثار صحابہ و تابعین اور مجتہدین کے اقوال کا تتبع کیا اور اپنے اصول مقررہ کے مطابق مسائل کا استنباط کیا۔“  
بلکہ خود امام بخاری رحمہ اللہ نے امام وکیع رحمہ اللہ کا قول ذکر کیا ہے:  
”من طلب الحديث كما جاء فهو صاحب سنة، ومن طلب الحديث ليقوي هواه فهو صاحب بدعة.“

(جزء رفع اليدين مع جلاء العينين: ۱۲۰)  
”جس نے حدیث کی طلب کی کہ اس پر من و عن عمل کرے وہ اہل سنت ہے اور جو اپنی آراء و خواہشات کی تقویت کے لیے حدیث طلب کرتا ہے وہ بدعتی ہے۔“  
امام بخاری رحمہ اللہ اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:  
”يعني أن الإنسان ينبغي أن يلغي رأيه لحديث النبي ﷺ حيث ثبت الحديث، ولا يعلل بعلل لا يصح ليقوي هواه.“  
یعنی انسان کو چاہیے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی حدیث ثابت ہو جائے تو وہ اپنی رائے چھوڑ دے اور اپنی خواہش اور رائے کو تقویت دینے کے لیے کمزور علت سے اسے معلول اور ضعیف قرار دینے کی کوشش نہ کرے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کی ایسی ایمان افروز وضاحت کے بعد ان کی الجامع الصحیح میں ان کے مذہبی رجحانات کا عمل دخل بتلانا کس قدر گندا اور بدبودار الزام ہے۔ مگر ادھر تو اعتراف ہے کہ ہم یہ ساری ”خدمت“ مذہب کی حمایت میں سرانجام دے رہے ہیں۔ غور فرمائیے اور بتلائیے کہ جب اپنا ہدف ہی یہ بنا لیا جائے تو اس ”کار خیر“ کا انجام کیا ہوگا؟ یہی حقیقت واضح کرنے کے لیے ہم ”إعلاء السنن“ کا جائزہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اپنے مذہب کی تائید میں کتنے پاؤں بیلے گئے،

یہ ”شوشہ“ چھوڑنے والے بزرگ چونکہ خود عمر بھر اپنے حنفی مذہب کی اسی تناظر میں ”خدمت“ سرانجام دیتے رہے جس کا احساس انھیں عمر کے آخری حصے میں ہوا۔ اور افسردگی کے عالم میں اعتراف کیا کہ ہم نے تو عمر ضائع کر دی۔ جس کی تفصیل مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم کے رسالہ ”وحدت امت“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ افسوس ہے کہ اپنے مذہب کی خدمت کے حوالے سے ان کے نہاں خانہ قلب میں جو کچھ تھا ان ائمہ محدثین کو بھی اسی کا مصداق قرار دے دیا۔ أف لكم ولما تعبدون

بعض نے اس احساس محرومی کو دور کرنے کے لیے اور اپنے مذہب کو مدلل کرنے کے لیے کتابیں لکھیں، انھی میں ایک کتاب ”اعلاء السنن“ ہے۔ جس میں پورے ”جذبہ صادقہ“ سے حنفی مذہب کو مدلل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور بڑے شد و مد سے اس کا اظہار اور اعتراف کیا گیا۔ انصاف شرط ہے کہ کیا اس ساری تگ و تاز میں فقہی مذہب کا کوئی اثر نہیں؟ امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کا اصل الاصول تو صحیح حدیث کو بنایا۔ فقہائے کرام کا اختلاف اور اس حوالے سے احادیث کا ذخیرہ ان کے پیش نظر تھا۔ جس صحیح حدیث کو انھوں نے اپنے اصول و قواعد کے مطابق پایا اسے کتاب کی زینت بنایا اور وہی ان کا مذہب ٹھہرا۔ اسی حقیقت کا اظہار شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان الفاظ سے کیا ہے:

(( فلم يكن عندهم من الرأي أن يجمع على تقليد رجل ممن مضى، مع ما يرون من الأحاديث والآثار المناقضة في كل مذهب من تلك المذاهب فأخذوا يتتبعون أحاديث النبي ﷺ وآثار الصحابة والتابعين والمجتهدين على قواعد أحكموها في نفسوهم. )) (حجة الله: ۱/۱۴۹)

”وہ اس کے قائل نہ تھے کہ سلف میں سے کسی ایک کی تقلید کی جائے، انھیں علم تھا کہ ان تمام مذاہب میں سے ہر

رضا کے کام آسان فرمائے اور انہی راہوں پر چلتے ہوئے ایمان پر موت نصیب فرمائے۔ آمین



مولانا معین الدین لکھوی اور قاری محمد اسماعیل اسد رحمہ اللہ

### کی وفات پر تعزیت

گزشتہ دنوں مفکر اسلام حضرت مولانا معین الدین لکھوی رحمہ اللہ (سرپرست اعلیٰ، مرکزی جمعیت اہل حدیث، پاکستان) کا انتقال پر ملال ہوا۔ اسی طرح مولانا قاری محمد اسماعیل اسد بھی داغ مفارقت دے گئے۔ دفتر الاعتصام میں مرحوم علمائے کرام کی تعزیت کے سلسلے میں خطوط، ٹیلی فون اور اجلاسوں کی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں۔ ان سب کی تعزیت شائع کرنے کے بجائے صرف ناموں پر اکتفا کیا جا رہا ہے: ① میاں محمد یوسف صاحب، آپٹیکل سنٹر، نیا بازار، قصور۔ ② ملک عبدالرشید عراقی صاحب، سوہدرہ۔ ③ قاضی محمد رمضان صدیقی صاحب، منڈی بہاؤ الدین۔ ④ حکیم پروفیسر عبدالحکیم سیف، کوٹ رادھا کشن۔ ⑤ حکیم محمد یحییٰ عزیز ڈاھروی۔ ⑥ مولانا محمد رمضان یوسف سلفی، فیصل آباد۔ ⑦ شیخ الحدیث مولانا عبدالعزیز علوی۔ ⑧ چوہدری محمد یلین ظفر۔ ⑨ مولانا محمد یونس بٹ (جامعہ سلفیہ، فیصل آباد)۔ ⑩ حافظ مسعود عالم صاحب، فیصل آباد۔ ⑪ حافظ ریاض احمد عاقب، ملتان۔ ⑫ ڈاکٹر محمد امین اطہر، فاروق آباد۔ ⑬ محمد صدیق حسن (بھومن شاہ) اوکاڑا۔ ⑭ لیاقت علی باجوہ، سیالکوٹ۔ ⑮ عطاء محمد جنجوعہ، سرگودھا۔ ⑯ مولانا محمد یلین شاد، ملتان۔ (محمد سلیم چنیوٹی)

### مقام اہل بیت رحمہ اللہ کانفرنس

مرکزی جامع مسجد اہل حدیث محلہ گوڑھا، منڈی بہاؤ الدین میں مقام اہل بیت رحمہ اللہ کانفرنس ۲۷ دسمبر ۲۰۱۱ء بروز منگل منعقد ہو رہی ہے۔ خطیب پنجاب مولانا منظور احمد (گوجرانوالہ)، مولانا احتشام الحق بھوپالوی اور دیگر مقررین خطاب کریں گے۔

(قاضی محمد رمضان صدیقی، خطیب مسجد ہذا)

عدل وانصاف کی کیسے دھجیاں اڑائی گئیں، اپنے ہی پسندیدہ اصولوں کو کیسے کیسے تار کیا گیا۔ آپ ان شاء اللہ ملاحظہ فرمائیں گے کہ مذہب کی تائید میں کیسے کیسے راویوں اور کیسی کیسی احادیث کا سہارا لیا گیا، اس میں اکثر و بیشتر استدلال کی پوزیشن تقریباً وہی ہے جو اہل کوفہ کو نبی کے جواز کے لیے پیش کرتے تھے اور امام عبداللہ بن ادریس رحمہ اللہ نے انہیں فرمایا تھا:

”یا اهل الكوفة! إنما حديثكم الذي تحدثونه في الرخصة في النبذ عن العميان والعوران والعمشان، أين أنتم عن أبناء المهاجرين والأنصار!“ (بیہقی: ۳۰۶/۸ وغیرہ)

”اے اہل کوفہ! نبی کی رخصت کے بارے میں تمہاری احادیث جو تم بیان کرتے ہو وہ اندھوں، کانوں اور چندھوں سے ہیں، مهاجرین اور انصار کی اولاد سے کیوں روایت نہیں کرتے۔“

اہل الرائے تاویل کے بادشاہ ہیں۔ اطمینان قلب کے لیے وہ جو چاہیں تاویل کریں مگر صحابہ کرام کو اپنی تاویل کی بھیجٹ چڑھانا کون سی خدمت ہے؟ جس کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ ان شاء اللہ

ناسپاسی ہوگی اگر میں یہاں ادارۃ العلوم الاثریہ کے تمام معاونین کا شکریہ ادا نہ کروں جن کے تعاون سے ادارہ مسلسل ٹھوس علمی بنیادوں پر کتاب و سنت کی خدمت اور مسلک سلف کی پاسبانی و ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ اسی طرح میں اپنے رفقاء کار جناب مولانا عبداللہ انصاری، مولانا طارق محمود ثاقب، قاری محمد بشیر، مولانا حافظ محمد ضییب احمد اور حافظ محمد ارشاد صاحب رحمہ اللہ کا بھی انتہائی شکر گزار ہوں جن کے شبانہ روز تعاون سے ہی یہ تمام علمی کام سر آ رہے ہیں۔ جزاھم اللہ أحسن الجزاء

اللہ سبحانہ و تعالیٰ تمام حضرات کی حسنات اور اس کارِ خیر میں ان کے تعاون کو قبول فرمائے، اپنی مرضیات سے نوازے اور ہمیشہ اپنی

## قادینیوں نے حق قبول کرنے کے بجائے مولانا محمد ابراہیم میرسیالکوٹی کی کتاب کو پھاڑ دیا

ابوصہیب محمد داود ارشد

سلیم، اور مولوی علی محمد اور مولوی عبدالرحمن گجراتی نے مباحثہ قلعہ سیالکوٹ میں خیانتا پھاڑ ڈالا تھا، صفحہ: ۵۶۳، ۵۶۴۔ اس کا حوالہ ”کشف الحقائق“ میں مفصل دیا گیا ہے۔ میرسیالکوٹی۔“ اس تحریر نے میراشک یقین میں بدل دیا کہ یہ کتاب امام العصر مولانا محمد ابراہیم میرسیالکوٹی رحمہ اللہ کی ملکیت تھی۔ اس کو پڑھتے ہی میرا ذہن ڈیڑھ صدی پیچھے چلا گیا۔ کتاب کو دیکھ کر بار بار زبان حال سے کہتا کہ اس جلد کو سفیر ختم نبوت کے ہاتھ لگے ہیں۔ ان اوراق کو میرے بزرگ نے احیاء سنت اور ابطال باطل کے لیے کئی بار پڑھا ہوگا۔ ان سے کئی فوائد اخذ کیے ہوں گے۔ مناظروں میں اس کو ہاتھ میں لہراتے ہوئے حریف کو لکارتے ہوں گے۔ کبھی کہتے ہوں گے کہ کون کہتا ہے کہ اس حدیث کا یہ معنی ہے، مسند حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ کبھی اسے کلکتہ کے مناظرے میں قادیانی اکابر کے سامنے پیش کر کے انھیں شرمسار کیا ہوگا، کبھی کراچی میں میدان مارا ہوگا، کبھی پشاور کے مناظرے میں قادیانی متکلم سے کہتے ہوں گے:

”سب (صدر و معاونین اور مناظر) مل کر اسے پڑھیے، آپ نے حافظ ابن حجر کے کلام کو سمجھا نہیں یا پھر عوام الناس کو مغالطہ دیا ہے۔“

بھٹی ہوئی جلد سے ہی علامہ میر مرحوم نے مناظرہ سیالکوٹ میں ایک عبارت پڑھ کر قادیانی اکابرین کو ندامت کے دریا میں ڈبو دیا تھا۔ میرے لیے یہ کتاب قادیانیوں کی عبرت ناک شکست کی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ ممکن ہے کہ آج کا نوجوان طبقہ اسے ادھام سے

ایک عزیز نے خاکسار کو فون پر اطلاع دی کہ مکرم ضیاء اللہ کھوکھر صاحب کے پاس چند قدیم کتب مکرر ہیں۔ وہ آپ کو کچھ دینا چاہتے ہیں، آکر لے جائیے۔ مجھ ایسے لوگوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اور تحفہ نہیں، لہذا خاکسار اگلے روز ان کے دولت کدے پر تھا۔ علیک سلیک کے بعد انھوں نے ایک بچے سے کہا کہ فلاں کتابیں مولانا صاحب کو دکھا دی جائیں، ان کتابوں میں سے جو میری پسند کی تھیں، ان کو میں نے منتخب کر لیا۔ ان میں سے ایک کتاب طبع الانصاری، دہلی کی فتح الباری تھی۔ گھر آ کر بوجہ علم حدیث کا طالب علم ہونے کے، سب سے پہلے فتح الباری کو دیکھا۔ آج سے تقریباً ایک سو تیس سال قبل شائع ہونے والی کتاب کی حالت کافی بہتر تھی۔ پڑھنے والے نے بڑی توجہ سے اسے پڑھا ہوا تھا۔ جگہ جگہ نوٹ و حواشی رقم تھے۔ قاری کا خط پختہ تھا اور وہ خود نہایت ہی باذوق معلوم ہوتا تھا۔ بعض حواشی اس کے سلفی العقیدہ ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ اور وہ علم میں پختگی کی وجہ سے کمال کا نکتہ اخذ کرتا۔ کتاب کے اوراق بتا رہے تھے کہ اسے بار بار پڑھا گیا ہے۔ گو میرے پاس قرائن و شواہد تھے کہ کتاب کس کی ملکیت تھی مگر دل چاہتا تھا کہ کوئی وزنی دلیل مل جائے تاکہ جلد بندی کے بعد اس پر نوٹ تحریر کردوں کہ یہ فلاں عالم دین کے زیر استعمال رہی۔ کہتے ہیں: ”من جد و جد“ ”جس نے کوشش کی اس نے پالیا۔“ آخر مجھے اس کی چھٹی جلد کے گتے پر ایک تحریر مل گئی جو حسب ذیل ہے:

”ورق جو مرزائی مولویوں: غلام رسول راجیکی، اور مولوی

”قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ تمیں کے قریب جھوٹے دجال پیدا ہوں گے، جو تمام کے تمام نبوت کا دعویٰ کریں گے۔“ (بخاری و مسلم)

علمائے امت اس سے ہمیشہ یہ استدلال کرتے رہے ہیں کہ مرزا جی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کا محض دعویٰ نبوت ہی اس کے دجال و کذاب ہونے کی دلیل ہے کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس فرمان میں اپنے بعد مدعی نبوت کو دجال اور کذاب قرار دیا ہے۔ یہ استدلال جتنا قوی ہے اس سے کہیں زیادہ مرگ مرزائیت ہے۔ کیونکہ یہ حدیث قادیانیوں کی تمام تاویلات فاسدہ کی یکسر نفی کرتی ہے، اس لیے یہ حدیث مرزائی مناظرین کے حلق کی ہڈی ہے۔ ان آئمہ کفر سے جب اس کا کوئی جواب بن نہیں پڑتا تو بخاری و مسلم کی اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (احمدیہ پاکٹ بک، ص ۵۴۰ طبع ۱۹۳۲ء)

مناظرہ سیالکوٹ میں قادیانی متکلم محمد سلیم<sup>(۱)</sup> نے کہا: ”تمیں دجال والی حدیث جو بار بار پیش کی جاتی ہے سو اس کی بابت ہم کئی دفعہ کہہ چکے ہیں کہ یہ بقول حافظ ابن حجر ضعیف ہے۔“ (کشف الحقائق، ص: ۶۳)

اس پر نقد کرتے ہوئے علامہ میر صاحب نے کہا: ”قریباً تمیں دجال والی حدیث کو ضعیف کہنا، جو صحیحین کی متفق علیہ حدیث ہے، چھوٹا منہ اور بڑی بات کا مصداق ہے۔ اور اس کے لیے آپ نے حافظ ابن حجر کا جو حوالہ ذکر کیا ہے اسے آپ سمجھ نہیں سکے۔ جناب حافظ صاحب ستر والی روایت کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ دو طریق سے مروی ہے اور ان دونوں کی اسناد ضعیف ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قریباً تمیں والی اور ستر والی ہر دو روایات ضعیف ہیں۔ دیکھیے فتح الباری جو ان کی اپنی تصنیف ہے، اس میں نہایت صفائی سے فرماتے ہیں:

تعبیر کرے۔ میں ان کے جذبات کی قدر کرتا ہوں، مگر اپنے اسلاف کے آثار علمی کو ردی کے بھاؤ بازار میں فروخت کرنا بھی زندہ اقوام کا شعار نہیں، بلکہ ان کو محفوظ کرنے کی عادت ڈالنی اور نئی نسل کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیے۔ یہ جہاں علم دوستی ہے وہاں آنے والی نسل کے لیے ایک یادگار بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ بھلا کرے ضیاء اللہ کھوکھر صاحب کا اور ان پر دنیا و آخرت میں برکات و رحمتیں نازل کرے جنہوں نے نذیر احمد سبحانی رحمۃ اللہ علیہ سے اسے قیماً خریدا، اسے محفوظ رکھا اور پھر مجھ جیسے نالائق کے ہاتھ میں فی سبیل اللہ تھما دی۔

قادیانیوں نے ورق کیوں پھاڑا؟

جس دور (۱۹۳۳ء) میں یہ مناظرہ ہوا، اس زمانے میں چھپائی کا ذریعہ لیتھوگرافی تھا۔ کاتب کاغذ پر لکھتا، اسے پتھر کی پلیٹ پر نقش کیا جاتا اور کتابت ضائع ہو جاتی۔ دوسری اشاعت کے لیے یا تو پتھر کی پلیٹوں کو محفوظ کر لیا جاتا (جن کی حفاظت مشکل ہوتی) یا پھر دوبارہ کتابت کروا کر شائع کیا جاتا۔ اشاعت کا طریق کار مشکل ہونے کی وجہ سے اکثر کتب نایاب رہتیں۔ شائع شدہ کتاب کو حاصل کرنا بھی بڑا مسئلہ تھا۔ امام العصر رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاں علم و فضل کی نعمت سے نوازا تھا وہاں دنیاوی مال و دولت کا بھی وافر حصہ عطا کیا تھا بلکہ ان کا شمار سیالکوٹ کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔

ان کے لیے پیسہ مسئلہ نہ تھا مگر نادر علمی کتاب (جس کی آئے روز ضرورت رہتی تھی) کا ضائع ہو جانا تو بہر حال ایک تکلیف دہ چیز تھی۔ موجودہ دور میں سہولیات اور وسائل کی فراوانی کے باوجود بسا اوقات کسی کتاب کا حصول اہل علم کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے۔ قادیانیوں نے حق کو قبول کرنے کے بجائے کتاب سے ورق اس لیے پھاڑ دیا کہ چلو جتنی دیر نئی کتاب میر صاحب نہیں خرید لیتے، تب تک تو شرمساری سے بچا جاسکے۔

پھٹے ہوئے ورق پر کیا ہے؟

اس ورق پر معروف حدیث ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

(۱) قادیانی مناظرین میں آنجنابی سلیم کا شمار دو تین ممتاز اصحاب میں ہوتا تھا۔ خاصے مجھے ہوئے مناظر اور عربی زبان کے علاوہ انگلش میں بھی کلام کر سکتے تھے۔ مصر میں قادیانی مبلغ بھی رہے۔ (ابوصہیب)

مولانا میر نے کتاب کو اندر سے دیکھے بغیر رکھ لیا۔ چند ایام کے بعد جب مکرر اس کی ضرورت پیش آئی تو معلوم ہوا کہ ورق سچ مچ پھٹا پڑا تھا، چونکہ کتاب کی جلد موٹی تھی اور سلائی عمدہ تھی، اس لیے ورق نکل نہیں سکا اور ٹیڑھا پھٹنے سے چوری ظاہر ہونے کا اندیشہ ہوا تو اسی طرح اٹکا ہوا رہنے دیا۔

مولانا میر صاحب کا خیال ہے کہ یہ پاجیانہ شرارت عبدالرحمن خادم کی ہے کیونکہ کتاب اسی کے ہاتھ میں رہی۔ مزید یہ کہ مناظرہ روپڑ میں جب خادم صاحب نے سورہ انفال کی آیت غلط پڑھی تو میں نے اپنی حائل اس کے پاس بھیجی۔ بار بار کے اصرار کے باوجود عبدالرحمن خادم نے نہ تو آیت کی غلطی کا اعتراف کیا اور نہ حائل شریف واپس کی۔ آخر بہت اصرار کے بعد مولوی غلام رسول آف راجیلی مرزائی کے کہنے پر حائل واپس لوٹائی گئی۔

(کشف الحقائق، ص: ۷۲-۷۴ ملخصاً)  
اصل حقیقت سے تو اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے مگر قرآن و شواہد سے مولانا میر کی بات کی تائید ہوتی ہے کیونکہ عبدالرحمن خادم یہودانہ تحریف کرنے کا عادی تھا۔ اس کی کتاب احمدیہ پاکٹ بک اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اختصار کے پیش نظر یہاں ایک مثال دی جاتی ہے: وہ لکھتا ہے:

”تیس دجالوں والی حدیث کو ترمذی نے جس طریق سے نقل کیا ہے اس کی اسناد میں ابو قلابہ اور ثوبان دو راوی ناقابل اعتبار ہیں۔ ثوبان کے متعلق ازدی کا قول ہے: ”یتکلمون فیہ“ (میزان: ۱/۱۷۳) کہ اس راوی کی صحت میں کلام ہے۔“ (احمدیہ پاکٹ بک، ص: ۵۳۱، ۵۳۲ طبع قادیانی: ۱۹۳۵ء طبع جدید ربوہ، ص: ۳۱۲)

ترمذی کی جس حدیث میں خادم کیڑے ڈال رہا ہے اس کی سند میں ثوبان نام کا جو راوی ہے وہ صحابی رسول ہے اور ان کے حق میں ازدی نے کوئی بات نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو قادیانی عقائد و مکائد سے محفوظ رکھے، آمین یا اللہ العالمین!

”وفی رواية عبد الله بن عمرو عند الطبراني: ((لا تقوم الساعة حتى يخرج سبعون كذاباً.)) وسندها ضعيف، وعند أبي يعلى من حديث أنس نحوه وسنده ضعيف أيضاً.“

(فتح الباري: ۶/۵۶۴ طبع دہلی)

”عبداللہ بن عمرو کی روایت میں امام طبرانی کے نزدیک یہ وارد ہے کہ ستر کذاب نکلیں گے اور اس کی سند ضعیف ہے۔ اور ابویعلیٰ کے نزدیک حضرت انس کی حدیث سے بھی اسی طرح ہے اور اس کی سند بھی ضعیف ہے۔“

مولانا میر نے جب اس عبارت کو پڑھ کر سنایا تو قادیانی منتکلم نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور اپنی خفت کو مٹانے کے لیے کہا کہ کتاب دیجیے۔

مولانا مرحوم نے کتاب دے دی اور لکارتے ہوئے کہا کہ چاروں صاحب ”غلام رسول صاحب راجیکی، محمد سلیم، عبدالرحمن اور علی محمد“ سر جوڑ کر اس کا مطالعہ کریں۔

جب مولانا میر نے کتاب مرزائیوں کی طرف بھیجی تو آپ سے مولانا احمد دین صاحب لکھنؤوی رحمہ اللہ نے کہا کہ مولانا! ان کو کتاب نہیں دینی چاہیے، اس لیے کہ ایک دفعہ میں نے ان کو کتاب بھیجی تھی تو انھوں نے صرف مطلب والا ورق درمیان میں سے پھاڑ ڈالا تھا، ایسا نہ ہو کہ آپ کی اس قیمتی کتاب کو بھی نقصان پہنچائیں۔ مولانا میر نے فرمایا کہ نہیں، یہ لوگ مجھ سے ایسا سلوک نہیں کر سکتے، خصوصاً غلام رسول صاحب کی موجودگی میں کہ اول تو وہ معمر بزرگ ہیں، دیگر یہ کہ میں نے ان کو چنیوٹ میں مار پیٹ سے بچایا تھا۔ وہ اس وقت سے اپنی بزرگی کی وجہ سے احسان مانتے ہیں۔

خیر قادیانی مربی سر جوڑ کر کتاب کا مطالعہ کرنے لگے اور شرمندگی کو اندر ہی اندر چھپانے لگے۔ اس کے بعد مرزائیوں کو گفتگو کے لیے کئی ٹرمز میسر آئیں اور مولانا میر نے کئی دفعہ مطالبہ کیا کہ فتح الباری کے حوالے کا کیا جواب ہے۔ لیکن قادیانی منتکلم نے آخر تک اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ کتاب بھی مناظرے کے اختتام پر واپس کی۔



## کرسمس..... شرک کا تہوار

حامد کمال الدین

”اور وہ لوگ جو باطل پر حاضر نہیں ہوتے، اور کسی یہودہ چیز پر ان کا گزر ہو تو متانت کے ساتھ گزرتے ہیں۔“  
آیت میں جس باطل کا ذکر ہوا ہے اس کے متعلق ابن کثیر و دیگر مفسرین نے تابعین کی ایک بڑی جماعت کا قول ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد جاہلیت کے تہوار ہیں۔ اس تفسیر کی رو سے ”عباد الرحمن“ کا شیوہ یہ ٹھہرا کہ وہ ایسی جگہوں کے پاس نہ پھکیں جہاں اہل جاہلیت اپنے شرکیہ تہوار منانے میں مگن ہوں۔

۲۔ ابووداد، مسند احمد اور ابن ماجہ میں حدیث آتی ہے:

عن ثابت بن ضحاک: نذر رجل علی عهد رسول اللہ ﷺ أن ینحر إبلًا ببوانة، فقال النبی ﷺ: ((هل كان فیها وثن من أوثان الجاهلیة یعبد؟)) قالوا: لا، قال: ((فهل كان فیها عید من أعیادهم؟)) قالوا: لا، فقال النبی ﷺ: ((أوف بنذرك، فإنه لا وفاء لنذر فی معصیة أو فیما لا یملك ابن آدم.))

دور رسالت مآب ﷺ میں ایک آدمی نے نذر مانی کہ وہ بوانہ کے مقام پر اونٹ قربان کرے گا۔ تب نبی ﷺ نے فرمایا: ”کیا وہاں پر جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت تو نہیں پوجا جاتا تھا؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو کیا وہاں ان کے تہواروں میں سے کوئی تہوار تو منعقد نہیں ہوتا تھا؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: نہیں۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: ”اپنی نذر پوری کر لو کیونکہ کسی ایسی نذر کا پورا کرنا درست نہیں جو معصیت ہو یا جو آدمی کے بس سے باہر ہو۔“

اس حدیث کے ضمن میں علمائے کرام کہتے ہیں: وہ صحابی رضی اللہ عنہ تو

ہر شخص کو معلوم ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ ہر سال ۲۵ دسمبر کو یہ اپنے اعتقاد کے مطابق (نعوذ باللہ) خدا کے ہاں بیٹا پیدا ہونے پر خوشیاں مناتے ہیں۔ کرسمس خدا پر ایک کھلا بہتان ہے، یعنی خدا کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کا تہوار؛ ایک ایسی بات جس پر آسمان کانپ اٹھتا ہے اور زمین لرز جاتی ہے۔ قرآن شریف میں اس پر وعید آئی ہے:

”اور وہ بولے: رحمن بیٹا رکھتا ہے۔ یقیناً تم نے ایک نہایت گھناؤنی بات بول ڈالی۔ قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ اس لیے کہ انھوں نے رحمن کے لیے بیٹا تجویز کر ڈالا۔ رحمن کے تو لائق ہی نہیں کہ اولاد رکھے۔“ (مریم: ۸۸-۹۲)

پھر بھی اسلام وہ دین ہے جس میں کوئی زبردستی نہیں۔ دنیا کی زندگی انھیں اپنے اس کفر پر رہنے کی آزادی ہے اور سزا کا ایک دن مقرر ہے۔ ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم انھیں خدا پر ایسا بہتان گھڑنے سے خبردار کریں۔ اپنے نبی ﷺ کا یہ مشن اب ہمیں انجام دینا ہے کہ عیسائی اقوام کو ان کے اس شرک پر خدا کی پکڑ سے ڈرائیں۔ البتہ ایسی کوئی روادری ہمارے دین میں نہیں کہ جس وقت وہ اپنے اس بہتان پر خوشیاں منا رہے ہوں کہ آج کے دن (نعوذ باللہ) خدا کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا تو ہم ان کو مبارک سلامت کہہ کر آئیں اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوں۔ آدمی کی غیرت دینی سلامت ہو تو یہ بات خود بخود سمجھ آتی ہے۔ فقہاء نے اس چیز کے حرام ہونے پر شریعت سے باقاعدہ دلائل ذکر کیے ہیں:

۱۔ قرآن مجید میں رحمن کے بندوں کی صفت بیان ہوئی ہے:

﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾ [الفرقان: ۷۲]

امام ابن القیم الجوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”یہ ایسا ہی ہے کہ مسلمان اُسے صلیب کو سجدہ کر آنے پر مبارکباد پیش کرے! یہ چیز اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے کہ آدمی کسی شخص کو شراب پینے پر یا ناحق قتل پر یا حرام شرمگاہ کے ساتھ بدکاری کرنے پر مبارکباد پیش کرے۔“

(أحكام أهل الذمة: ۲۱۱/۳)

چند اشکالات اور ان کا جواب:

۱۔ ایک اشکال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ کرسس اب کوئی مذہبی تہوار نہیں رہ گیا بلکہ ایک سماجی تہوار بن چکا ہے۔

مدینہ میں نبی ﷺ نے جو جاہلی تہوار ختم کروائے خود اُن کے متعلق ثابت نہیں کہ وہ اہل مدینہ کے کوئی خاص مذہبی تہوار تھے، پھر بھی آپ ﷺ نے سب جاہلی تہوار ختم کروا دیے۔ دراصل یہ ایک چور دروازہ ہے جو اس وقت کھلوا جا رہا ہے جس سے ”کرسس“ ہی نہیں ”دیوالی“ کی راہ بھی کھل جائے گی، یعنی ہندو ”امن کی آشا“ کو بھی یہی حجت کام دے جائے گی!

۲۔ ایک اشکال یہ کہ شریعت نے ہمیں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا جو حکم دیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم کرسس پر اُن کو مبارکباد پیش کیا کریں اور ان کے ساتھ مل کر کرسس یک کاٹیں۔

ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کے ساتھ پیش آنے کا یقیناً شریعت میں حکم ہے مگر سوال یہ ہے کہ ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بہتر کون کر سکتا ہے! جبکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کرسس ایسے کسی تہوار میں شرکت کرنا یا مبارکباد دے کر آنا نہ تو ثابت ہے اور نہ ہی (نعوذ باللہ) اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس، صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ ثابت ہے کہ دورِ عمر میں جب نئی اقوام داخل اسلام ہوئیں تو مسلمانوں کو کفار کے تہواروں میں شرکت سے ممانعت فرمائی گئی، جیسا کہ اوپر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم نامہ ذکر ہوا۔ پس ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک کا جو حکم ہے لامحالہ وہ عام دنیوی معاملات میں ہے نہ کہ ان کے کفریہ شعائر میں شرکت اور شمولیت۔

قطعاً کسی بت پر چڑھاوا دینے یا کوئی جاہلی تہوار منانے نہیں جا رہا تھا لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی تسلی فرمانا چاہی کہ ماضی میں بھی وہاں نہ تو کوئی بت پوجا جاتا تھا اور نہ کوئی جاہلی تہوار منایا جاتا تھا۔ اس سے واضح ہوا کہ مسلمان کا ان اشیاء سے دور رہنا شریعت کو کس شدت کے ساتھ مطلوب ہے۔

۳۔ فقہاء نے اس مسئلے پر اجماع نقل کیا ہے کہ امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے شام کے عیسائیوں کو باقاعدہ پابند فرمایا تھا کہ دارالاسلام میں وہ اپنے تہواروں کو کھلے عام نہیں منائیں گے؛ اور اسی پر سب صحابہ رضی اللہ عنہم اور فقہاء کا عمل رہا ہے، چنانچہ جس ناگوار چیز کو مسلمانوں کے سامنے آنے سے ہی ممانعت ہو، مسلمان کا وہاں جانا کیونکر روا ہونے لگا؟

اس کے علاوہ کئی روایات سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ حکم نامہ منقول ہے: ”لا تعلموا رطانة الأعاجم، ولا تدخلوا علی المشرکین فی کنائسہم یوم عیدہم فإن السخطة تنزل علیہم۔“ (اقتضاء الصراط المستقیم لشیخ الإسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ)

”عجمیوں کے اسلوب اور لہجے مت سیکھو۔ اور مشرکین کے ہاں اُن کے گرجوں میں ان کی عید کے روز مت جاؤ کیونکہ ان پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔“

علاوہ ازیں کافروں کے تہوار میں شرکت اور مبارکباد کی ممانعت پر حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ سب متفق ہیں۔ (فقہ حنفی: البحر الرائق لابن نجیم، ۵۵۵/۸، فقہ مالکی: المدخل لابن حاج المالکی: ۶/۲-۴۸، فقہ شافعی: مغنی المحتاج للشرینی: ۱۹۱/۴، الفتاویٰ الکبریٰ لابن حجر الہیثمی: ۲۳۸/۴-۲۳۹، فقہ حنبلی: کشف القناع للہوتی: ۱۳۱/۲)

فقہائے مالکیہ تو اس حد تک گئے ہیں کہ جو آدمی کفر کے تہوار پر ایک تربوز کاٹ دے وہ ایسا ہی ہے گویا اُس نے خنزیر ذبح کر دیا۔

(اقتضاء الصراط المستقیم، ص: ۳۵۴) کافر کو اُس کے شرک کے تہوار پر مبارکباد دینا کیسا ہے؟ اس پر



## مولانا معین الدین لکھوی

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ علیہ

مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ علیہ کا اصحاب علم پر عمومی اور جماعت اہل حدیث پر خصوصی احسان ہے کہ انھوں نے بیسیوں علمائے کرام پر سوانحی مضامین اور خاکے تحریر فرما دیئے ہیں اور بعض اہل علم پر تو انھوں نے الگ الگ تصانیف بھی تحریر فرمادی ہیں، جس سے ہم اپنے اسلاف سے آگاہ، ان کی خدمات سے واقف اور ان کے تذکار سے مستفید بھی ہو گئے اور کم و بیش گزشتہ ایک صدی کی تاریخ بھی محفوظ ہو گئی۔ تقبل اللہ سعیم وجعلہم مشکورا۔

ابھی گزشتہ ہفتے علم، اصلاح، تدین اور ملکی و جماعتی سیاست کی ایک جسم تاریخ یعنی مولانا معین الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ ہمیں داغ مفارقت دے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا بھٹی رحمۃ اللہ علیہ کا لکھوی خاندان سے کس قدر قدیمی، گہرا اور عقیدت مندانہ تعلق رہا؟ اس کی تفصیلات جاننے کے لیے قارئین مولانا کی دو تصانیف ..... ”بزم ارجندان“ اور ”قافلہ حدیث“..... کا مطالعہ فرمائیں تو انھیں اس محبت، تعلق اور عقیدت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ اور مولانا معین الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ پر الگ مضمون کے علاوہ ان کی تصنیف نقوش عظمت رفتہ میں بھی مولانا معین الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کا ضمناً ذکر فرمایا ہے۔ نقوش عظمت رفتہ اور بزم ارجندان مکتبہ قدوسیہ لاہور کی طرف سے شائع کی گئی ہیں۔ مولانا بھٹی رحمۃ اللہ علیہ کا مولانا معین الدین صاحب سے یکم جنوری ۱۹۳۷ء میں تعارف ہوا جو تادم واپس باقی رہا۔ یہ تعلق صرف تعلق نہ تھا بلکہ عقیدت بھری محبت کی ایک ایسی داستان ہے جس کی مثال شاید کم ہی ملے گی ع پون صدی کا قصہ ہے برس دو برس کی بات نہیں

یہی محبت مولانا بھٹی رحمۃ اللہ علیہ کو بیماری کے باوجود جنازہ تک پہنچ لائی تھی۔ مولانا لکھوی پر ان کی زندگی ہی میں جب مولانا بھٹی نے مضمون لکھ کر مولانا کو دکھایا تو مولانا بہت خوش ہوئے۔ شدید بیماری کے دنوں میں مولانا لکھوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا بھٹی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی خاطر اپنے سیکرٹری عزیزم سرفراز لکھوی کو لاہور بھجوا کر اکاڑا بلوایا۔ یہ مضمون مولانا بھٹی رحمۃ اللہ علیہ کے مارچ ۱۹۹۸ء کے تحریر فرمودہ مضامین سے ہی ترتیب دیا گیا ہے۔ آپا دھاپی کے اس دور میں یہ محبت، اخوت، رکھ رکھاؤ اور باہمی احترام و اکرام بلاشبہ ایک نادر بات تھی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ مولانا لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے اور مولانا بھٹی کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ (ادارہ)

۱۹۳۷ء کے پہلے مہینے کی پہلی تاریخ یعنی یکم جنوری کو میں اور میرے ایک ہم جماعت حاجی محمد رفیق <small>رحمۃ اللہ علیہ</small> ، استاذ محترم حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small> کے ساتھ طالب علم کی حیثیت سے مرکز الاسلام پینچے۔ فیروز پور سے براستہ بنگلہ فاضلکا، بہاول نگر اور سمہ سٹہ جانے والی ٹرین، دن کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے فیروز پور سے روانہ ہوتی تھی، ہم اسی ٹرین سے گئے تھے۔ پہلا اسٹیشن کھائی مہمیکئی اور دوسرا جھوک ٹہل سنگھ تھا، جو فیروز پور سے بجانب مغرب چودہ میل کے فاصلے پر واقع تھا اور کرایہ تھا چار آنے.....!	جھوک ٹہل سنگھ کے ریلوے اسٹیشن سے نصف میل کے فاصلے پر دوسرے سنگل کے قریب دائیں جانب مرکز الاسلام تھا۔ بارہ بجے کے
---	--

نام سے اس کا نام ”ڈھنگ شاہ“ پڑا۔ وہ نہایت نیک اور پارسا بزرگ تھے اور لوگوں کی اصلاح اور تبلیغ دین ان کا اصل کام تھا۔ ان کی نیکی اور صالحیت کی وجہ سے عوام میں انھیں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔

ابوداؤد (یا ڈھنگ شاہ) کے پوتے حافظ محمد امین تھے۔ وہ بھی انتہائی صالح اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے اور ان کے شب و روز دین کی نشر و اشاعت میں گزرتے تھے۔ وہ اپنے آبائی گاؤں سے نقل مکانی کر کے لاہور آ گئے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام حافظ احمد تھا اور دوسرے کا حافظ نور محمد.....!

حافظ محمد امین نے لاہور میں رہ کر دونوں بیٹوں کو دینی تعلیم دلائی۔ جب بیٹے زیور تعلیم سے آراستہ ہو گئے تو حافظ محمد امین (بیٹوں سمیت) لاہور کی سکونت ترک کر کے فیروز پور آ گئے اور یہیں اقامت اختیار کر لی۔ فیروز پور کے گرد و نواح میں ان باپ بیٹوں نے اسلام کی خوب تبلیغ کی اور لوگوں کو اللہ کی توحید اور اتباع سنت کا درس دیا۔ حافظ محمد امین نے فیروز پور ہی میں وفات پائی ورنہ دہلی دروازے کے اندر بڑے بازار میں ”نوگزنے“ کی قبر کے قریب دفن کیے گئے۔

حافظ صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے..... حافظ احمد اور حافظ نور محمد..... فیروز پور سے چلے گئے تھے۔ حافظ نور محمد نے تو فیروز پور کے قریب ایک گاؤں ”بارے کے“ میں اقامت اختیار کر لی اور حافظ احمد فیروز پور سے مغرب کی جانب چودہ میل کے فاصلے پر موضع ”لکھو کے“ میں جا آباد ہوئے اور اس نواح میں دعوت و ارشاد اور تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے جہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ علم و عمل، تقویٰ و صالحیت اور درس و تدریس کے حلقوں میں اس چھوٹے سے گاؤں نے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ موضع ”لکھو کے“ کے قریب ایک گاؤں ”طور“ تھا، وہاں کے رئیس نے اپنی بیٹی حافظ احمد کے عقد میں دے دی تھی، جس کے بطن سے ۱۲۰۱ھ (۸۶۷ء) میں حافظ بارک اللہ پیدا ہوئے۔ وہ بڑی نیک اور صالحہ خاتون تھیں۔ ان کے شوہر حافظ احمد بھی بے حد متقی

قریب ترین سے اتر کر ہم مرکز الاسلام کی حد میں داخل ہوئے تو وہاں کا جو سب سے پہلا باشندہ ہمیں ملا، میں آج سے ساٹھ سال قبل کے اس کے حلیے کی وساطت سے آپ کو اس سے ملانے کی کوشش کرتا ہوں۔

کشیدہ قامت، متوازن صحت مند جسم، اٹھتی جوانی، سرخی مائل گورا رنگ، آنکھوں میں حیا کے عنصر کا غائبہ، مناسب چہرہ نہ لمبا نہ گول، ناک نقشہ جاذب نظر، چھوٹے چھوٹے دانت، باریک ہونٹ، سفید لباس میں ملبوس، اس زمانے کے عام رواج کے مطابق تہ بند باندھے ہوئے، چہرے پر معصومیت کے آثار نمایاں اور متانت کے جوہر ہویدا۔ چہرہ مہرہ بالوں کے جنجال سے آزاد..... چڑھتی جوانی بالعموم دوسروں کے لیے جذبہ احترام سے بے پروا ہوتی ہے، لیکن اس نے گردن جھکا کر اور نگاہیں نیچی کر کے نہایت احترام کے ساتھ انتہائی نرم آواز میں السلام علیکم کہہ کر پہلے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے اور مصافحہ کیا۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہوا۔

یہ وہ جوان رعنا تھا، جس نے سٹشی حساب کے مطابق اس واقعے سے ٹھیک ساٹھ سال ایک مہینہ بعد ۳۔ فروری ۱۹۹۷ء کو ضلع قصور کے تحصیل چوئیاں کے ایک بہت بڑے زمیندار اور صوبہ پنجاب کے بھاری بھر کم اور امیر ترین وزیر اعلیٰ سردار عارف ٹکئی کو قومی اسمبلی کے انتخاب میں پینتیس ہزار سے زائد ووٹ حاصل کر کے ان کے گھر میں شکست دی..... یعنی مولانا معین الدین لکھوی.....! حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے فرزند ارجمند..... متحدہ پنجاب کے اولین مفسر قرآن حضرت حافظ محمد لکھوی کے پڑپوتے۔ میرا ان سے پچھتر سال تعلق رہا اور بہت گہرا تعلق رہا۔

مولانا محمد علی سے سات پشتیں پہلے اس خاندان کے ایک بزرگ حافظ محمد امین تھے، ان کا اصل وطن ضلع قصور کا ایک گاؤں ”ڈھنگ شاہ“ تھا۔ ان کے دادا کا نام ابوداؤد تھا جو لوگوں میں ”ڈھنگ شاہ“ کے عرف سے معروف ہوئے۔ یہ گاؤں ان کی ملکیت تھا اور انہی کے



بزرگ تھے اور اپنے علاقے اور عہد کے جید عالم.....! حافظ بابر اللہ نے نیکی و پارسائی کے ماحول میں شعور کی دہلیز پر قدم رکھا اور تقویٰ و صالحیت کی فضا میں پرورش پائی۔ والد گرامی سے قرآن مجید حفظ کیا، انہی سے عربی و فارسی کی کتابیں پڑھیں اور علوم متداولہ اور فنون مروجہ میں مہارت حاصل کی۔

بعد ازاں دہلی کا عزم فرمایا اور شاہ غلام علی دہلوی سے اکتساب فیض کیا۔ اس زمانے میں دہلی شہر بہت سے مشاہیر علما و صلحا کا مرکز تھا، ان میں سے بعض حضرات سے بھی انھوں نے استفادہ کیا۔

حافظ بابر اللہ کے دو بیٹے تھے۔ حافظ محمد لکھوی اور مولوی محمد صالح۔ دونوں نے باپ سے علم حاصل کیا اور ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے۔ مولوی محمد صالح کے حالات نہیں ملتے، لیکن حافظ محمد لکھوی کے علم و ادراک اور تصنیف و تالیف کی معرکہ آرائیوں کا کسی زمانے پنجاب میں گھر گھر چرچا تھا، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

حافظ بابر اللہ لکھوی اتباع سنت اور حق گوئی میں نہایت جری تھے۔ اس باب میں وہ کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان کے زمانے میں موضع ”لکھو کے“ ریاست ممدوٹ میں شامل تھا اور قصبہ ممدوٹ اس ریاست کا دارالحکومت تھا۔ پنجاب پر سکھوں کا قبضہ تھا اور ممدوٹ کا حکمران مسلمان تھا جس کا نام نواب قطب الدین تھا۔ ایک دن نواب قطب الدین اپنے مصاحبوں اور وزیروں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا۔ کسی نے اس سے کہا کہ لکھو کے میں ایک بہت بڑے بزرگ اور عالم دین حافظ بابر اللہ فروکش ہیں، ہم ادھر آئے ہیں تو چلیے ان سے بھی ملتے جائیں۔ یہ لوگ ان سے ملاقات کے لیے مسجد میں گئے تو وہ طلبا کو قرآن و حدیث کا درس دے رہے تھے۔ نواب نے سونے کے نگن پہن رکھے تھے۔ اس نے حافظ صاحب کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو انھوں نے ہاتھ جھٹک دیے اور فرمایا ہم درویش لوگ دنیا داروں سے منقطع ہو کر مسجد میں بیٹھے ہیں، یہاں بھی یہ لوگ غیر شرعی چیزیں پہن کر ہمارے پاس

آتے اور ہمیں پریشان کرتے ہیں..... یہ الفاظ کہہ کر جلدی سے اٹھے اور تیزی کے ساتھ مسجد کے اندر چلے گئے..... نواب نے ان کے اس طرز عمل اور اسلوب گفتگو کو گستاخی پر محمول کیا اور اس کا پندار حکمرانی یہ برداشت نہ کر سکا کہ مسجد کا ایک درویش جو اسی کے گاؤں میں رہنے والا ہے اور اس کی رعیت میں شامل ہے، اس کے حضور اس قسم کا رویہ اختیار کرے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اسے اسی وقت گاؤں سے نکال دیا جائے۔ لوگوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور علاقہ بدری کا یہ سخت حکم واپس لینے کے لیے کہا، لیکن وہ نہیں مانا۔

حافظ صاحب اپنے اہل و عیال اور چند عقیدت مندوں کے ساتھ گاؤں سے نکلے اور دریائے ستلج کے کنارے آگئے جو وہاں سے تھوڑے فاصلے پر بہتا تھا۔ وہاں سے کشتی پر سوار ہوئے اور ریاست بہاول پور کو روانہ ہو گئے۔ ان کا ارادہ مکہ مکرمہ جانے کا تھا۔

موجودہ جغرافیائی صورت حال کے مطابق وہ ہیڈ سلیمان کی کے قریب ”حاصل ساڈو“ کے مقام پر اترے اور یہاں انھوں نے پہلا پڑاؤ کیا۔ لیکن لکھو کے سے ان کی روانگی کے بعد یہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ بلا غاہری اسباب و آثار کے دریائے ستلج میں شدید طغیانی آگئی، جس سے ممدوٹ میں نواب قطب الدین کے باغات و محلات اور شاہی قلعے کو شدید نقصان پہنچا اور نواب اس ناگہانی آفت سے سخت پریشان ہوا۔

اس کے مصاحبوں نے کہا کہ یہ مصیبت اس درویش بزرگ حافظ بابر اللہ کی وجہ سے پیش آئی ہے، جسے آپ نے محض کلمہ حق کہنے کے باعث اپنی ریاست سے نکال دیا ہے..... اب نواب نے چند تیز رفتار گھڑ سواروں کو حافظ صاحب کے پیچھے دوڑایا اور معزز اہل کاروں کا ایک وفد نواب بہاول پور کے پاس بھیجا کہ وہ یہاں تشریف لائے ہوں تو نہایت اعزاز کے ساتھ انھیں ارکان وفد کے ہمراہ واپس ممدوٹ بھیج دیا جائے۔

حضرت حافظ بابر اللہ کو چند روز کے بعد واپس لایا گیا تو نواب

”یعنی ان دنوں ایک بزرگ میاں بارک اللہ سے ملاقات ہوئی جو خان مذکور (نواب قطب الدین) سے ناخوش تھے اور ریاست بدر کردیے گئے تھے۔ وہ بہت ہی شفقت اور مہربانی سے پیش آئے، ان کے ارادت مند بھی نہایت محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔“

کتاب کے قلمی نسخے میں ”تبارک اللہ“ مرقوم ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ ”منظورۃ السعداء“ کئی مرتبہ نقل ہوئی اور مختلف حضرات نے اسے نقل کیا۔ اس کی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں پہنچی۔ ساڑھے چھ سو ورق اور تیرہ سو سے زائد صفحات میں پھیلی ہوئی یہ کتاب نقل درنقل کے مرحلوں سے گزرتی رہی اور اس طرح کسی نقل نویس نے ”بارک اللہ“ کو ”تبارک اللہ“ بنا دیا۔ کتاب میں الفاظ کی اور بھی متعدد غلطیاں ہیں، بعض مقامات کے نام صحیح نہیں لکھے گئے۔ قلمی کتابوں میں بالعموم کتابت کی غلطیاں ہوجاتی ہیں۔

نواب ممدوٹ سے پیش آنے والا یہ واقعہ مولابخش کشتہ مرحوم نے بھی اپنی کتاب ”پنجابی شاعراں دا تذکرہ“ میں بیان کیا ہے، لیکن انھوں نے لکھا ہے کہ اس نواب کا نام جمال الدین تھا، کشتہ مرحوم کو نام لکھنے میں غلطی لگی ہے، صحیح بات یہ ہے کہ اس کا نام نواب قطب الدین تھا۔ منظورۃ السعداء میں قطب الدین ہی لکھا ہے۔

”پنجابی ادب دی کہانی“ میں عبدالغفور قریشی نے بھی حافظ بارک اللہ کا ذکر کیا ہے۔

میں نے یہ واقعہ سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی سے سنا تھا۔ اس کے بعد مختلف کتابوں میں پڑھا۔

۱۹۵۵ء میں مولانا غلام رسول مہر کی کتاب ”جماعت مجاہدین“ شائع ہوئی تو انھوں نے مجھے یہ کتاب الاعتصام میں تبصرے کے لیے بھیجی۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۰۲ پر انھوں نے ”منظورۃ السعداء“ کے حوالے سے ”تبارک اللہ“ لکھا ہے، میں نے تبصرے میں بھی اور خط کے ذریعے بھی مہر صاحب مرحوم کو توجہ دلائی کہ اصل نام بارک اللہ ہے، تبارک اللہ نہیں ..... اسی اثنا میں ان کی زیر تصنیف کتاب

قطب الدین ان سے بے حد تکریم کے ساتھ پیش آیا اور ”لکھو کے“ گاؤں انھیں بطور جاگیر دینا چاہا، مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ فرمایا پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس گاؤں کی ضرورت نہیں، دوسری بات یہ کہ ہم وہ زمین نہیں لینا چاہتے، جس کا لگان، اور معاملہ و آبیانہ وغیرہ ہم حکومت کو ادا کرنے پر مجبور ہوں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ طغیانی کا واقعہ پیش آنے سے پہلے ریاست کا صدر مقام ممدوٹ تھا، اس کے بعد نواب مذکور جلال آباد منتقل ہو گیا تھا اور اسی شہر کو ریاست کا صدر مقام بنا لیا گیا تھا، چنانچہ تقسیم ملک تک جلال آباد ہی صدر مقام رہا۔ نیز یہ کہ شاہی محلات کے جو حصے دریا کی طغیانی کی زد میں آکر منہدم ہو گئے تھے، تقسیم ملک تک اسی حالت میں تھے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ ۱۲۴۵ھ (۱۸۳۰ء) میں مجاہدین کا ایک قافلہ سید جعفر علی نقوی کی قیادت میں سرحد پار جاتے ہوئے ”حاصل ساڈو“ کے مقام پر رکا تھا اور ان کی ملاقات حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی سے ہوئی تھی، جس کا ذکر سید جعفر علی نقوی نے اپنی کتاب ”منظورۃ السعداء فی احوال الغزاة والشہداء“ کے ورق ۶۳۴ پر کیا ہے۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے اور فارسی زبان میں ہے۔ کتاب تیرہ سو سے زائد صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس کا صرف ایک ہی نسخہ ہے اور وہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

سید جعفر علی نقوی نے حافظ بارک اللہ لکھوی کی ملاقات سے ستائیس برس بعد ۱۲۷۲ھ میں یہ کتاب لکھی تھی۔ انھوں نے حافظ صاحب اور ان کے معتقدین کا ذکر انتہائی احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

”در اایام میاں بارک اللہ بزرگے بودند کہ از خان مذکور نا خوشنود شدہ از عمل او بیروں رفتہ بودند، از ایشان ملاقات نمودم، تلطف بسیار نمودند و مریدان شاں محبت بسیار نمودند۔“

الصرف“ لکھی، جس میں عربی علم صرف ۱۷ قواعد بیان کیے گئے ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جو پنجاب میں عام طور سے پڑھی جاتی تھیں۔ مرد اور عورتیں ان سے خوب استفادہ کرتے تھے۔ دیہات و قصبات میں بالخصوص ان کتابوں کی بہت مانگ تھی۔ اب بھی انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حافظ محمد لکھوی کا دائرہ علم اور حلقہ اثر بے حد وسیع تھا۔

حضرت حافظ صاحب نہایت ذہین اور تیز فہم عالم تھے۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت سے قبل وہ دہلی میں حضرت میاں سید نیر حسین دہلوی کے حلقہ درس میں شامل تھے۔ میاں صاحب ان کی ذہانت اور علمی استعداد و قابلیت کے بے حد معترف و مداح تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے حلقہ درس میں ایک پنجابی طالب علم حافظ محمد شامل ہے جو اس درجے ذہین اور قوت اخذ کا مالک ہے کہ میری زبان سے بات نکلنے سے پہلے ہی سمجھ لیتا ہے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

ان کا حافظہ اس قدر قوی اور مضبوط تھا کہ جس کتاب پر ایک مرتبہ نظر ڈالی، اس کے حوالے اور صفحوں کے صفحے زبانی یاد ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت میاں صاحب از راہ تلقین طبع انھیں مہتمم کتب خانہ کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

حافظ صاحب نے فارسی، صرف و نحو، معانی، منطق، فقہ، اصول فقہ اور تجوید وغیرہ اکثر علوم عربیہ کی تحصیل اپنے والد محترم حافظ بارک اللہ لکھوی سے کی تھی، سلسلہ بیعت بھی انھی سے تھا۔ سند حدیث شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی اور مولانا احمد علی سہارن پوری سے حاصل کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد میر محبوب علی سے بھی استفادہ کیا۔

لکھو کے میں حافظ بارک اللہ اور حافظ محمد لکھوی دونوں باپ بیٹے نے مدرسہ جاری کیا۔ اس کا ذکر ایک کتاب ”تاریخ پرگنہ مکتسر و مہوٹ“ میں واضح الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف سید ثار علی ہیں۔ وکٹو یہ پریس لاہور میں یہ کتاب ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی

”سرگزشت مجاہدین“ کے لیے میں نے مولانا محمد علی لکھوی کے مختصر حالات انھیں لکھ بھیجے تو انھوں نے مولانا کے تذکرے کے ضمن میں حافظ صاحب کے نام کی تصحیح کر کے اسے ”بارک اللہ“ بنا دیا اور میرے حوالے سے کتاب کے صفحہ ۶۵۰ اور صفحہ ۶۵۱ پر مولانا کا ذکر کیا۔ میں نے بھی حافظ بارک اللہ کے حالات اپنی تصنیف ”فقہاے پاک و ہند“ کی تیرہویں صدی ہجری کی جلد اول میں (صفحہ ۱۱۹ تا ۱۳۹) بیس صفحات میں لکھے ہیں۔

حافظ بارک اللہ لکھوی باعمل عالم اور نہایت متقی بزرگ تھے۔ پنجابی کے شاعر تھے۔ ”انواع بارک اللہ“ کے نام سے انھوں نے پنجابی اشعار میں ایک کتاب تصنیف کی جو شرعی مسائل پر مشتمل اور سو چار صفحات پر محیط ہے..... انھوں نے اور ان کے بیٹے حضرت حافظ محمد لکھوی نے اپنے گاؤں میں ایک مدرسہ جاری کیا تھا، جس میں مختلف ادوار کے بہت سے علمائے تحصیل علم کی۔

حافظ بارک اللہ نے ۸۶-۸۷ سال کی عمر میں ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۱ء) کو وفات پائی اور اپنے گاؤں لکھو کے میں دفن کیے گئے۔

ان کے فرزند گرامی حافظ محمد لکھوی تھے، جنھوں نے ہندوستان کے نامور اہل علم سے استفادہ کیا۔ وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے سات ضخیم جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر پنجابی اشعار میں لکھی، جس کا نام ”تفسیر محمدی“ رکھا۔ احوال قیامت میں ”احوال الآخرت“ لکھی، مسائل فقہ میں ”زینت الاسلام“ تصنیف کی جو دو جلدوں پر مکتوی ہے۔ عربی میں حدیث کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد کے حواشی تحریر کیے۔ مشکوٰۃ کا حاشیہ بھی سپرد قلم فرمایا..... ”انواع محمدی“ کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں پنجابی اشعار میں دینی و فقیہی مسائل معرض بیان میں لائے گئے ہیں۔

دینی مدارس میں ایک کتاب ”ابواب الصرف“ پڑھائی جاتی ہے اور طلباء کو اس کے ابواب زبانی یاد کرائے جاتے ہیں، یہ کتاب حضرت حافظ محمد لکھوی کی تصنیف ہے..... اسی طرح فارسی نظم میں ”قوانین

الدین رکھا۔ اس کے بعد ایک اور بیٹے کی ولادت ہوئی، جن کا نام محمد حسین رکھا۔ یہ بھی ممتاز عالم اور مدرس تھے۔ ۱۸۷۶ء میں پیدا اور ستمبر ۱۹۴۳ء میں فوت ہوئے۔ ان سطور کے راقم کو ان کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔

مولانا محی الدین عبدالرحمن جید عالم اور نہایت متقی بزرگ تھے۔ ان سے بہت لوگوں نے کسب فیض کیا، بے شمار علما و طلبا ان کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور ان سے حصول علم کیا۔ انھوں نے علم حدیث دہلی جا کر حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ سے حاصل کیا تھا۔

حضرت حافظ محمد لکھوی کو جب حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے علم و عرفان اور اتقا و صالحیت کا پتا چلا تو اپنے اس صاحب زادے مولانا محی الدین کو حصول فیض کے لیے ان کی خدمت میں غزنی بھیجا۔ حضرت عبداللہ صاحب انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر انتہائی خوش ہوئے۔ انھوں نے ان کا نام عبدالرحمن رکھا، چنانچہ وہ مولانا محی الدین عبدالرحمن لکھوی کے نام سے معروف ہوئے۔ وہ یکے بعد دیگرے دو مرتبہ حضرت عبداللہ غزنوی کی خدمت میں غزنی گئے۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی فرمایا کرتے تھے کہ جب وہ لکھو کے سے غزنی کو روانہ ہوئے تو حافظ محمد صاحب نے ان کو سو روپے زاد راہ کے طور پر دیے تھے۔ مولانا کہا کرتے تھے کہ یہ اس دور میں بہت بڑی رقم تھی جو باپ نے بیٹے کو دی۔ وہ تعجب و حیرت کے انداز میں ارشاد فرمایا کرتے تھے: ”سو روپے دیے، سو روپے“

یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں فرط جذبات سے آنسو آ جاتے تھے۔

مولانا محی الدین عبدالرحمن لکھوی بہ درجہ غایت متقی اور پیکر زہد و عبادت تھے۔ نماز انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتے تھے۔

نواب وحید الزمان حیدر آبادی ان کی نماز کے سلسلے میں تسہیل القاری (اردو ترجمہ صحیح بخاری) پارہ پنجم صفحہ ۱۴۰-۱۴۱ میں تحریر

تھی۔ اس کے صفحہ ۸ کے یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

”یہ بہت نیک اور مشہور لوگ ہیں۔ ذی علم ہونے کی وجہ سے مولوی کہلاتے ہیں۔ اکثر لوگ انھیں وہابی کہتے ہیں۔ لہذا (لکھو کے) میں ان کے خاندان میں عالم ہوتے رہے ہیں اور مولوی صاحب (حافظ بارک اللہ) کے باعث چرچا علم بنے (بہت) اچھا رہتا ہے، بلکہ بعض طلبا سوائے فارسی کے علم عربی بھی تحصیل کرتے ہیں۔ اور ان کو سرکار (مدوٹ) کی طرف سے دو چاہ ملے ہوئے ہیں۔ گاؤں کچا ہے، مگر وہاں کی مسجد پختہ ہے جو حافظ محمد صاحب کے اہتمام میں فیض بخش قوم کبوتر ارائیں ساکن فیروز پور تھانے دار ضلع نے تعمیر کرائی ہے۔“

لکھو کے کے مدرسے کا نام مدرسہ محمدیہ تھا۔ اس میں حافظ صاحب خود اور ان کے ساتھ ان کے بھتیجے حضرت مولانا عبدالقادر محدث لکھوی فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔ مولانا عبدالقادر کے صاحب زادہ گرامی قدر مولانا عطاء اللہ لکھوی تھے جو استاذ پنجاب کے لقب سے معروف ہیں۔ وہ حافظ محمد صاحب کے داماد تھے۔ (ان کے حالات دبستان حدیث میں معرض تحریر میں لائے گئے ہیں)۔ انھوں نے چوالیس سال اس مدرسے میں خدمت تدریس انجام دی۔ مولانا عبدالقادر لکھوی نے ۱۹۲۴ء میں اور ان کے فرزند گرامی مولانا عطاء اللہ لکھوی نے ۲۶ فروری ۱۹۵۲ء کو وفات پائی، رحمہم اللہ تعالیٰ

حضرت حافظ محمد لکھوی کو پتھری کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، اپریشن کرایا مگر کامیاب نہ ہوا۔ اسی عارضے سے ۱۳- صفر ۱۳۱۱ھ (اکتوبر ۱۸۹۳ء) کو لکھو کے میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔

حافظ محمد لکھوی کے دو بیٹے تھے۔ بڑے مولانا محی الدین عبدالرحمن اور چھوٹے مولانا محمد حسین.....!

حافظ محمد کچھ عرصہ اولادِ زینہ سے محروم رہے۔ انھوں نے دعا مانگی اور عہد کیا کہ اگر ان کے بیٹا پیدا ہو تو وہ اسے راہِ خدا میں وقف کر دیں گے۔ دعا قبول ہوئی اور اللہ نے انھیں بیٹا عطا فرمایا، جس کا نام محی

فرماتے ہیں:

”ہمارے شیخ اتقی زماں مولوی عبدالرحمن رحمہ اللہ صاحب ساکن لکھو کے فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص نماز کے معنی نہیں جانتا، اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ جو شخص اس مسئلے میں ان کے خلاف پر اصرار کرتا تو اس سے مباہلے پر تیار ہو جاتے۔“

نواب وحید الزماں خاں صاحب کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولانا محی الدین عبدالرحمن کے شاگرد تھے اور ان سے مستفید ہوئے تھے۔

حضرت مولانا کی نماز کی طوالت، رکوع و سجود کی اطمینان و سکون سے ادائی اور خشوع و خضوع کی اس نواح میں بڑی شہرت تھی۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی سننے میں آیا تھا۔

اگر بزرگوں کے تذکرے میں لطیفہ بیان کرنے کو سوئے ادب نہ قرار دیا جائے تو عرض کروں۔

کہتے ہیں کسی شخص کا اونٹ گم ہو گیا تھا۔ وہ اونٹ تلاش کرتا کرتا لکھو کے آیا تو دیکھا کہ لوگ مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ اسے نماز پڑھنے کی عادت نہ تھی، تاہم وہ اس خیال سے نماز میں شامل ہو گیا کہ نماز کے بعد لوگوں سے اونٹ کے بارے میں دریافت کرے گا۔ جماعت مولانا محی الدین عبدالرحمن صاحب کر رہے تھے۔ وہ سجدے میں گئے تو سجدہ اس درجہ طویل تھا کہ اس شخص کے لیے امام کا ساتھ دینا مشکل ہو گیا، اور اُٹھ کر چلا گیا..... چھ مہینے کے بعد اس کی ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔

پوچھا: کہاں کے رہنے والے ہو؟

جواب دیا: لکھو کے کا.....!

پوچھا: تمہارے امام صاحب سجدے سے اٹھے یا نہیں؟

یہ تو ایک لطیفہ تھا، ممکن ہے واقعہ بھی ہو اور اسی طرح پیش آیا ہو۔ ویسے بھی ہم گنہگاروں کا گزارہ لطیفوں ہی پر ہے۔ ہم لطیفے سنتے اور آگے بیان کرتے رہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ انتہائی عبادت

گزار اور نہایت پرہیزگار بزرگ تھے۔ بارگاہ خداوندی سے انھیں علم کی بے پناہ دولت سے بھی نوازا گیا تھا اور خوف و خشیت اور انابت الی اللہ کی متاع بے بہا بھی ان کے حصے آئی تھی۔

مولانا محی الدین عبدالرحمن حج بیت اللہ کے لیے گئے اور اپنے والد کی وفات سے دو سال بعد ۱۳۱۳ھ کو مسجد نبوی میں بحالت سجدہ فوت ہوئے اور جنت البقیع میں شرقی دیوار کے ساتھ دفن کیے گئے۔

غزنوی اور لکھوی خاندانوں کے باہمی تعلقات اسی دور سے قائم ہیں جب مولانا محی الدین عبدالرحمن غزنی گئے تھے۔ چونکہ تعلقات کی بنیاد خالص روحانیت اور نیکی پر مبنی تھی، اس لیے دونوں خاندانوں کے پرانے بزرگ ان تعلقات کو بے حد اہمیت دیتے تھے۔ مولانا داود غزنوی لکھوی علماء کا تذکرہ انتہائی احترام کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

مولانا معین الدین لکھوی نے ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں حافظ محمد لکھوی کی کتاب ”احوال الآخرت“ اپنے استاذ مکرم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے اہتمام میں شائع کی تھی۔ اس کے آخر میں انھوں نے حافظ صاحب اور اپنے خاندان کے بعض بزرگوں کے مختصر حالات بیان کیے ہیں۔ ایک مکتوب گرامی بھی درج کیا ہے جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی نے ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں حافظ محمد لکھوی اور ان کے فرزند گرامی قدر مولانا محی الدین عبدالرحمن لکھوی کے نام تحریر فرمایا تھا۔ یہ مکتوب حضرت میاں صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا مولانا معین الدین کے والد نام دار حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے پاس محفوظ تھا جو ہمارے نزدیک نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علمی اعتبار سے حضرت میاں صاحب کی نظر میں حافظ محمد لکھوی اور مولانا محی الدین عبدالرحمن کس قدر ومنزلت کے حامل تھے۔ مکتوب فارسی میں ہے۔

مولانا معین العین نے اس مکتوب گرامی کو ”ایک علمی یادگار“ قرار دیا ہے اور بہ صورت عنوان لکھا ہے ”مجدد العصر جناب مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی قدس اللہ روحہ کا مکتوب گرامی مصنف احوال الآخرت اور ان کے فرزند ارجمند مولانا محی الدین عبدالرحمن



مولانا معین الدین سے راقم کی ۱۹۳۷ء کے شروع میں رسم وراہ کی ابتدا ہوئی تھی جو جلد ہی مضبوط تعلقات کے سانچے میں ڈھل گئی۔ یہ پورا تعلیمی سال بطور طالب علم میں مرکز الاسلام رہا جو مولانا معین الدین کا مسکن تھا اور ان کے گھر سمیت چار گھروں پر محیط تھا۔ صحاح ستہ کی مشہور کتاب سنن نسائی ہم نے ایک ساتھ پڑھی۔ ہمارے ایک ہم درس حاجی محمد رفیق تھے، وہ ۱۹۳۸ء میں حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کی خدمت میں کھنڈیلہ (ریاست جودھ پور) چلے گئے تھے اور میں مولانا عطاء اللہ حنیف کے حلقہ درس میں فیروزپور آ گیا تھا۔ مولانا عطاء اللہ صاحب مرکز الاسلام صرف ایک سال رہے تھے، بعد ازاں فیروزپور کی جماعت اہل حدیث کے اصحاب انتظام انھیں فیروزپور لے گئے تھے..... فیروزپور سے میں کئی دفعہ محی الدین اور معین الدین سے ملنے مرکز الاسلام گیا۔

مرکز الاسلام میں مہمان بکثرت آتے تھے، بعض اوقات روزانہ تیس بیس مہمان جمع ہو جاتے تھے اور ان کا کھانا معین الدین کے گھر سے آتا تھا جو ان کی قابل احترام خواتین تیار کرتی تھیں۔

معین الدین یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو لکھنؤ کے میں پیدا ہوئے۔ کچھ ہوش سنبھالا تو اپنے گاؤں کے سرکاری مڈل سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ مڈل پاس کرنے کے بعد میٹرک کا امتحان فیروزپور کے ہائی سکول میں دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ ابتدائی دینیات کی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ بعد ازاں مروجہ نصاب کی بہت سی کتابیں اپنے والد گرامی قدر مولانا محمد علی لکھوی اور اپنے لائق احترام ماموں استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی سے پڑھیں۔ بعض کتابوں کے لیے مولانا عطاء اللہ حنیف کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیے۔ پھر گوجرانوالا کا عزم کیا، وہاں حضرت العلامة حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ سے تفسیر و حدیث اور فقہ و اصول وغیرہ علوم متداولہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔

رانج الوقت علوم و فنون سے فراغت کے بعد یکے بعد دیگرے

کے نام.....“ جی چاہتا ہے یہ مکتوب گرامی ہمارے اصحاب تکریم قارئین بھی ملاحظہ فرمائیں۔ نیچے میاں صاحب کے نام کی مہر ہے جس میں یہ الفاظ کندہ ہیں:

سید محمد نذیر حسین ۱۲۸۱

اب ذیل میں وہ مکتوب ملاحظہ فرمائیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از جانب اضعف العباد، عائد باللہ، طالب الحسین، سید محمد نذیر حسین عافہ اللہ تعالیٰ فی الدارین۔ بخد مت بابرکت کاملین، وزاہدین صالحین مولوی حافظ محمد بن المرحوم مولوی بارک اللہ سلمہ ربہ فرزند ارجمند ایشاں محدث و عالم باعمل مولوی عبدالرحمن بن مولوی محمد سلمہما اللہ ساکنین لکھنؤ کے۔ بعد از سلام مسنون و دعاء اجابت مقرون، مبرہن راے لطافت، پیراے گرداد کہ برخوردار حافظ عبدالغنی را اشتیاق تحصیل علوم دینیہ شد، و در وطن خود برائے تحصیل آں فارغ البال گشتن محال مے داند، و دریافتن آں بجز سفر کردن مشکل بلکہ غیر ممکن می انگارد۔ و از اشغال دنیوی با فراغت نشستن بغایت دشوار۔

لہذا چونکہ تبحر شاد در علوم معتد بہا شنیدہ بود، بنا بریں پیش من بسیار الحاح کرد کہ مرا سفارش نوشتہ عنایت فرمائید۔ مرجوے او بر آردم۔ پس از راہ عنایت بشفقت تام و رافت تمام بہ تہذیب دینی و دنیوی ایں توجہ فرمائید و بہ نصیح کامل تربیت ایں فرمائید و از علوم میکہ جہل آنہا بہتر باشد تخویف نمائید، و سوائے ایں ہر چہ مناسب دانند مرحمت فرما باشند، و ایں برخوردار نیک عقیدہ و خوش مشرب است، زیادہ والسلام مع الاکرام، آخر الکلام و خیر الختام، الحمد لله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ و عترتہ و اہل بیتہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

العبد

خادم المومنین سید محمد نذیر حسین عفا اللہ عنہ

یہ تھا مولانا محمد علی لکھوی کا خاندان، اور یہ تھی ان کے خاندان کی خدمات بقلموں کی ایک جھلک۔

چکر لگایا تو معین الدین نے اسے شاباش دیتے ہوئے تھکی دی اور پیسے بھی دیے۔ اسے ان کی شخصیت کا پتا چلا تو جھک کر سلام کیا۔

سیاسی اور دینی رہنماؤں کو دیکھنے، ان کی تقریریں سننے اور ان سے میل ملاپ کا بھی معین الدین کو بے حد شوق تھا۔ ۱۹۳۹ء کے فروزی کی بات ہے، میں فیروز پور میں مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کے حلقہ درس میں شامل تھا کہ ایک دن معین الدین آئے اور رات وہیں رہے۔ صبح کو اخبار پڑھا تو اس میں یہ خبر نمایاں طور سے درج تھی کہ آج لاہور میں موچی دروازے کے باہر مولانا ابوالکلام آزاد تقریر کریں گے۔ ہم دونوں لاہور کے لیے تیار ہو گئے۔ لاہور پہنچے تو پتا چلا کہ آج مولانا کہیں تقریر نہیں کریں گے، البتہ گول باغ میں ان کے اعزاز میں لاہور کے شہریوں کی طرف سے چائے کی دعوت دی گئی ہے، اس میں شرکت کریں گے۔ پوچھتے پچھاتے ہم گول باغ پہنچے تو مولانا کی زیارت ہو گئی، اور ہم شام کو واپس فیروز پور آ گئے۔ معین الدین رات وہیں رہے۔ دوسرے دن اخبار میں پھر خبر شائع ہوئی کہ آج مولانا لاہور میں موچی دروازے کے باہر تقریر کریں گے۔ یہ تو مرکز الاسلام چلے گئے، لیکن میں لاہور آیا اور مولانا کی تقریر سننے کا شرف حاصل کیا۔

اپریل ۱۹۴۳ء سے جون ۱۹۴۷ء تک کا چار سال کا زمانہ بڑا عجیب و غریب زمانہ تھا۔ اس زمانے میں، میں مرکز الاسلام میں معلم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ عام طور سے دس بارہ روز کے بعد ہم نو بجے کی ٹرین سے فیروز پور چلے جاتے، ادھر ادھر کے چکر لگاتے اور جس کام سے گئے تھے، اس سے فراغت کے بعد، دہلی دروازے کے اندر بڑے بازار کے ایک ہوٹل میں بیٹھ جاتے اور اکل و شرب کا دور شروع ہو جاتا۔

معین الدین علمی اور روحانی اعتبار سے بڑے خاندان کے فرزند تھے، عالم دین اور علاقے میں صاحب اثر و رسوخ..... لکھو کے اور مرکز الاسلام کے دو مدرسوں کے مہتمم و ناظم..... عالم شباب ہی میں تدین و تقویٰ کے اوصاف سے بہرہ ور..... لیکن ان خصائص کے باوصف نہایت خوش مزاج اور خوش طبع..... لطیف حس مزاج کے

حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے دورہ تفسیر قرآن کی تکمیل فرمائی اور امتحان میں دونوں مقامات پر درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔

مولانا احمد علی صاحب کے حلقہ درس تفسیر میں کامیابی حاصل کرنے والوں میں اس سال سندات و انعامات مولانا عبید اللہ سندھی نے تقسیم کیے تھے۔ یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ معین الدین نے اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ ان کو سند اور انعام عطا فرماتے ہوئے مولانا سندھی نے فرمایا تھا کہ اس لڑکے کو تفسیر میں اول ہی آنا چاہیے تھا۔ پنجاب میں پہلی تفسیر اس کے پردادے حضرت حافظ محمد لکھوی نے لکھی تھی جو تفسیر محمدی کے نام سے سات ضخیم جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پھر انھوں نے فرمایا کہ مجھ پر اس خاندان کا بہت بڑا احسان ہے۔ میں اس لڑکے کے پردادے حافظ محمد کی تصنیف ”احوال الآخرت“ پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہوا تھا۔

میں ۱۹۳۷ء میں بطور طالب علم اور اپریل ۱۹۴۳ء سے جون ۱۹۴۷ء تک بطور مدرس مرکز الاسلام رہا۔ اس اثنا میں نہایت قریب سے معین الدین کو دیکھنے کا موقع ملا اور ان سے مستحکم تعلقات قائم ہوئے۔ کئی چھوٹے بڑے سفر ان کے ساتھ کیے اور بہت سے لوگوں سے ان کی معیت میں ملاقات کے مواقع میسر آئے۔ اس زمانے کے عام رواج کے مطابق وہ سفید لٹھے کا تہبند اور سفید قمیص زیب تن کرتے تھے، پاؤں میں بوٹ پہنتے اور سر پر طرے دار سفید ململ کی پگڑی باندھتے تھے اور بڑی شان سے رہتے تھے۔ گھوڑیاں رکھنے اور ان پر سوار ہونے کا انھیں بڑا شوق تھا اور فرید کوٹ سے پولو کھیلنے والی تیز رفتار مہنگی قیمت کی گھوڑی خرید کر لاتے تھے۔

کبڈی وغیرہ قسم کے کھیل کہیں نزدیک میں ہوتے تو وہ بھی دیکھنے جاتے۔ ایک دفعہ قریب کے گاؤں ”دلا رام“ میں کبڈی کا کھیل تھا اور دور دور سے لوگ آئے تھے۔ میں اور معین الدین بھی کبڈی دیکھنے گئے۔ کبڈی جیتنے والے نے رواج کے مطابق فاتحانہ انداز سے اکھاڑے کا

ایچھے خاصے منصب پر فائز تھے، نہایت خوش مزاج اور ہنس مکھ۔ ان کی وجہ سے میرے ساتھ بھی ان کے مراسم قائم ہو گئے تھے۔ وہ ان دنوں اجھرے میں قبرستان کے قریب کراے کے مکان میں رہتے تھے۔ لاہور میں رتن چند روڈ اور میکلوڈ روڈ کے درمیان ایک اچھا خاصا وسیع میدان تھا، جسے پیٹالہ گراؤنڈ کہا جاتا تھا۔ جنوری فروری کے دنوں میں ہر سال یہاں مختلف اشیاء کی نمائش لگائی جاتی تھی جو بڑی بارونق ہوتی تھی۔ چودھری برکت علی نے ایک مرتبہ ہمیں لاہور آکر نمائش دیکھنے کی دعوت دی، ہم یہاں آئے، کئی دن لاہور رہے، اور خوب سیر سٹائے کیے۔

معین الدین کی شادی حضرت مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ مولانا موصوف بہت بڑے مصنف، مشہور مترجم اور معروف مقرر تھے۔ علاوہ ازیں ان کا شمار دہلی کے دولت مند مسلمانوں میں ہوتا تھا۔ وہ مارچ ۱۹۴۱ء میں فوت ہوئے تھے۔ مدرسہ رحمانیہ کے قریب باڑہ ہندو راؤ میں ان کی شان دار کوٹھی تھی، جو ان کی وفات کے بعد ایک ٹرسٹ (یا مجلس منظمہ) نے اپنی تحویل میں لے لی تھی اور ان کے اہل و عیال کراے کے مکان میں رہنے لگے تھے۔ یہ مکان غالباً دہلی کے محلہ کرشن گنج میں تھا۔

جون ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ میں اور معین الدین اور ہمارے ایک مرحوم دوست قاضی عبید اللہ دہلی گئے، دو دن ہم اسی مکان میں رہے، جس میں مولانا معین الدین کے سسرال رہتے تھے۔ اس اثنا میں ہم نے ۲۱ جون کو مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی سے اور ۲۲ جون کو مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی۔ مولانا محمد عبدہ اس وقت مدرسہ رحمانیہ میں خدمت تدریس انجام دیتے تھے، اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے وقت ہمارے ساتھ تھے۔ مولانا ان دنوں ہندوستان کی عارضی حکومت میں وزیر تعلیم تھے اور ۲۲ پر تھوی راج روڈ، نئی دہلی میں قیام پذیر تھے۔ اسی کوٹھی میں ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اس وقت یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ملک میں آبادیوں کی اس طرح اتھل پتھل ہوگی کہ لوگ کہیں سے کہیں چلے جائیں گے۔

مالک..... جیسا کہ دوستوں کا معمول ہوتا ہے، ہماری مجلس میں ہر قسم کی باتیں ہوتی تھیں اور بے تکلفی سے ہوتی تھیں، لیکن بے تکلفی کا ہم نے ایک خاص دائرہ مقرر کر رکھا تھا، اس سے باہر کبھی نہیں نکلے۔ اسی کے احاطے میں رہتے تھے۔ اسے آپ ”محیط الدائرہ“ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر اس دائرے سے کبھی باہر نکلا بھی تو میں ہی نکلا، ایسے موقع پر معین الدین خاموشی اختیار کر لیتے۔

میں نے ان کے ساتھ بہت سفر کیے اور انھیں نہایت اچھا رفیق سفر پایا..... مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص کی تعریف کی، حضرت عمر نے بات سنی اور خاموش رہے۔ چند روز کے بعد اس نے پھر اس کے متعلق تعریفی الفاظ کہے۔ حضرت عمر اب بھی خاموش رہے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ اس نے پھر اسی قسم کے الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا۔

اب حضرت عمر نے اس شخص کے متعلق اس سے چند سوالات کیے، جن میں ایک سوال یہ تھا کہ تم نے کبھی اس شخص کے ساتھ سفر کیا ہے.....؟ جواب دیا نہیں۔ فرمایا پھر تمہیں کیا معلوم کہ وہ شخص کیسا ہے۔ کسی شخص کی اچھائی کا علم جن باتوں سے ہو سکتا ہے، ان میں ایک رفاقت سفر بھی ہے..... سفر میں کھانے پینے، خرچ اخراجات اور آرام و تکلیف کے متعدد مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، جو شخص ان معاملات میں دوسرے کا خیال رکھتا اور اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دیتا اور اس کو سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، وہ بہترین شخص ہے۔

میں نے معین الدین کے ساتھ کئی سفر کیے۔ ریل کا طویل سفر بھی، بس کا سفر بھی، تانگے کا بھی اور پیدل بھی۔ پھر ہم مسلسل کئی کئی دن سفر میں رہے ہیں..... سچی بات ہے، معین الدین میرے لیے ہمیشہ بہترین رفیق سفر ثابت ہوئے ہیں۔

مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین کے حلقہ احباب کے ایک رکن چودھری برکت علی تھے، جن کا تعلق سکونت فیروز پور کے قریب کے ایک گاؤں سے تھا۔ وہ لاہور میں اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں کسی

صاحب سے کہا: ”چھوہر بڑا چنگا سی، انھوں بچا دیو“ (لڑکا بڑا نیک ہے اسے بیماری سے بچا دو) حکیم صاحب نے جواب دیا، میں تو علاج کرنے والا ہوں، بچانے والا اللہ ہے۔

۱۹۴۷ء کے جون میں دو مہینے کی چھٹیاں ہوئیں تو ہم لوگ مرکز الاسلام سے اپنے گھر چلے گئے، مولانا معین الدین چندے کے لیے تحصیل چونیاں کو روانہ ہو گئے۔ تحصیل چونیاں اس وقت ضلع لاہور کی تحصیل تھی، اب ضلع قصور کی تحصیل ہے۔ معین الدین تحصیل چونیاں کے موضع روڈے والا میں تھے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا اور ساتھ ہی قتل و غارت کے سلسلے شروع ہو گئے۔ ان کے اعزہ واقارب اور بہن بھائی سب لکھو کے اور مرکز الاسلام یعنی مشرقی پنجاب ضلع فیروز پور میں تھے، اور یہ وہ علاقہ تھا جس میں مسلمانوں پر سکھ سخت مظالم ڈھا رہے تھے۔ معین الدین شدید پریشانی میں مبتلا تھے۔ اپنے اقربا کی خیر و عافیت کے لیے وہ دعا ہی کر سکتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ اگر ان کے عزیز اور رشتے دار خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں تو وہ اپنی پوری زندگی اللہ کے دین کے لیے وقف کر دیں گے۔ دعا قبول ہوئی۔ ان کے تمام عزیز خیر و عافیت سے پاکستان آ گئے اور انھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا، اس کے مطابق اپنے آپ کو اللہ کے دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

معین الدین اور ان کے رشتے دار اوکاڑے آ گئے۔ ہم لوگوں نے جڑانوالہ (ضلع فیصل آباد) کے ایک گاؤں کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔ مجھے پتا چلا کہ مولانا معین الدین اوکاڑا میں مقیم ہیں، ان سے ملاقات کے لیے اوکاڑے گیا۔ انھوں نے اپنی لکھو کے والی درس گاہ (جامعہ محمدیہ) کے تبادلے میں اوکاڑا میں ایک بلڈنگ الاٹ کرالی تھی۔ اپنے دو تین عزیزوں کے ساتھ یہ اس میں مقیم تھے۔ میں وہاں پہنچا تو چودھری غلام حسین تہاڑیہ بھی آ گئے۔ انھوں نے ضلع قصور کے ایک مقام ”تلوٹڈی“ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ بھی مرکز الاسلام میں معلم تھے اور انگریزی پڑھاتے تھے۔

اب تو اوکاڑا ”ضلع ہے۔ اس وقت ضلع منگمری (حال ساہیوال)

مولانا معین الدین نے مولانا آزاد سے سوال کیا کہ ہم لوگ جو دینی مدارس چلا رہے ہیں، آزاد ہندوستان میں ان مدارس کی کیا حیثیت ہوگی؟

انھوں نے فرمایا کہ آپ لوگ ان مدارس کو ان حالات کے مطابق چلائیں گے جو اس وقت پیدا ہوں گے اور اپنی استطاعت کے مطابق کام کریں گے..... لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا۔

قرآن کے یہ الفاظ مولانا آزاد نے کچھ اس انداز سے پڑھے کہ گویا اسی موقع پر ابھی نازل ہوئے ہیں۔

مولانا آزاد نے اس سے چند روز پیشتر لکھنؤ میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی تھی، جس میں دینی مدارس کے بعض اصحاب انتظام نے بھی شرکت کی تھی۔ معین الدین کے سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے اس کانفرنس کے انعقاد اور اس میں منظور شدہ تجاویز کا حوالہ بھی دیا تھا۔

ایک دفعہ معین الدین بیمار ہو گئے اور ان کی کلائی پر ایک پھوڑا سا نکل آیا، جس نے نازک صورت اختیار کر لی۔ فیروز پور کے سرکاری ہسپتال کے منتظم اعلیٰ ایک مسلمان ڈاکٹر تھے۔ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی، نہایت شریف آدمی اور نماز کے پابند۔ انھوں نے معین الدین کا آپریشن کیا۔ چند روز ہسپتال میں داخل رہے۔ ڈاکٹر ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس آپریشن کا نشان اب بھی ان کی کلائی پر موجود ہے۔ اس سے پہلے انھیں بخار ہونے لگا تھا اور کئی دن بخار رہا تو کسی نے ٹی بی کے شبہ میں ڈال دیا۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ اس وقت فیروز پور میں ملتانی دروازے کے باہر ایک مشہور طبیب رہتے تھے، جن کا نام حکیم احمد دیں تھا۔ وہ حکیم محمد اجمل خاں کے شاگرد تھے۔ دور و نزدیک سے بے شمار لوگ ان سے علاج کرانے آتے تھے۔ ان کی تشخیص بھی صحیح ہوتی تھی اور علاج بھی۔ لمبا قد، پتلے دبلے، پاجامہ پہنتے تھے، ناک میں بولتے تھے اور زبان کے سخت تھے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ نماز وغیرہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

لکھو کے میں ایک ڈوگر تھا، جس کا نام کالو تھا۔ اس نے حکیم

نہیں کہہ سکتا کہ مولانا معین الدین میرے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں، لیکن میرے دل میں ان کا انتہائی احترام بھی ہے اور ان سے بے حد پیار بھی.....! بسا اوقات کئی کئی مہینے ملاقات نہیں ہوتی، لیکن باہمی تعلقات کبھی غبار آلود نہیں ہوئے۔ مجھے ان کے سیاسی افکار سے اتفاق نہیں، نہ میں ضیاء الحق کو صحیح سمجھتا ہوں، نہ مسلم لیگی ہوں۔ لیکن اس عدم اتفاق کو نہ انھوں نے کبھی اہمیت دی ہے اور نہ میرے نزدیک یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ ہے۔

معین الدین مسلکی اور دینی اعتبار سے نہایت نازک احساسات کے مالک ہیں۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک عرصے تک اپنے کئی رفقا سمیت ساہیوال جیل میں قید رہے۔

۱۹۵۱ء میں انھوں نے مہاجر سیٹ سے صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے لیے اوکاڑا سے کاغذات نامزدگی داخل کرائے تھے۔ دوسری طرف ہمارے دوست رانا غلام صابر خاں تھے جو اپنے عزیزوں کی اونچی ملازمتوں کی بنا پر سرکاری حلقوں میں خاص اثر و رسوخ رکھتے تھے، جس کی وجہ سے معین الدین کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیے گئے اور رانا صاحب اسمبلی میں پہنچ گئے۔ معین الدین نے انتخابی عذر داری دائر کر دی، قانونی اعتبار سے ان کا موقف مضبوط تھا، لہذا رانا صاحب سخت پریشان ہوئے، ان کی رکنیت خطرے میں تھی۔ انھوں نے مجھ سے اور حضرت مولانا داود غزنوی سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ مولانا معین الدین عذر داری واپس لے لیں۔ مولانا ان دنوں تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں ساہیوال جیل میں تھے اور جامعہ محمدیہ کے آدھے حصے پر پناہ گزینوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ رانا صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ جامعہ محمدیہ سے پناہ گزینوں کا قبضہ ختم کرا دیں گے۔ معین الدین نے عذر داری واپس لے لی، لیکن رانا صاحب اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔

معین الدین کو اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت دی اور وہ تین مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

کی ایک تحصیل تھا۔ معین الدین کے رشتے دار اس تحصیل کے مختلف مقامات میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین نے دیپال پور کے قریب ایک گاؤں ”تار سنگھ“ کو اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ انھوں نے پہلے اس کا نام ”مرکز الاسلام“ رکھا، پھر ”الہ آباد“ کے نام سے موسوم کیا۔ معین الدین کو زمینوں کی الاٹ منٹ کے سلسلے میں کئی جگہ جانا اور پٹواریوں اور تحصیل داروں سے ملنا پڑتا تھا۔ زمینوں کی الاٹ منٹ کو اس زمانے میں ”عارضی مستقل الاٹ منٹ“ کہا جاتا تھا، یعنی آبادی کے محکمے نے اس میں دو تضاد جمع کر دیے تھے۔ ان کے نزدیک یہ الاٹ منٹ عارضی بھی تھی اور مستقل بھی.....!

اس بھاگ دوڑ کے لیے انھوں نے ساٹھ روپے کا نیا سائیکل خرید لیا تھا۔ مجھے اور چودھری غلام حسین کو ان کا یہ سائیکل دیکھ کر بڑا رشک آتا تھا۔ معین الدین ترس کھا کر ہم میں سے کسی کو کبھی یہ سائیکل دے دیتے تھے کہ جاؤ تم بھی میرے نئے سائیکل کی سواری سے لطف اندوز ہو جاؤ اور کچھ سیر سپاٹا کر آؤ۔

اللہ! کتنی سخت تکلیف میں مبتلا تھے وہ لوگ جو قیام پاکستان کے بعد مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب میں آئے تھے۔ اب تو ہم ہنس کر اس دور کی باتیں کرتے ہیں، اس وقت جو کچھ بیت رہی تھی، اس کا اندازہ انہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ یہ لوگ بھوک سے مر رہے تھے اور یہاں کے اکثر مقامی باشندے لوٹ کھسوٹ میں لگے ہوئے تھے۔ اب یہ لوگ سکھوں کے حامی بنے ہوئے ہیں۔

چودھری غلام حسین تہاڑیہ کا نام ان سطور میں کئی دفعہ آیا ہے۔ نئے لوگوں سے ان کا تعارف اس طرح کرایا جائے گا کہ یہ ہمارے ملک کے مشہور صحافی و ادیب اسد اللہ غالب کے سر ہیں۔ آج کل تلونڈی ضلع قصور میں رہتے ہیں۔

کچھ دن میں مولانا معین الدین کے پاس اوکاڑے رہا۔ پھر اپنے نئے وطن چک نمبر ۵۳ گ ب چلا گیا اور اس سے دو تین مہینے بعد لاہور آ گیا اور اب تک یہیں ہوں۔ قلم کی مزدوری میرا پیشہ ہے۔ میں



حسب معمول بہت اچھی طرح ملے اور خوب کھلایا پلایا، چند باتیں بھی کیں، لیکن مصروفیت تعویذات ہی میں رہی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کہا، اب بس کرو، میرے ساتھ بھی کوئی بات کرو، میں نے واپس لاہور جانا ہے۔ آہستہ سے بولے، خاموشی سے بیٹھے رہو، تم آج رات میرے پاس رہو گے۔

معین الدین چودہ پندرہ سال مرکزی جمعیت کے منصب امارت پر فائز رہے اور اس اثنا میں انھوں نے بڑی خدمات انجام دیں۔ ضیاء الحق کے ساتھ ان کے بڑے گہرے مراسم تھے، اس نے مجلس شوریٰ بنائی تو ان کو اس کا رکن نامزد کیا۔ کیونکہ وہ مولانا کی نیکی اور دین داری سے متاثر تھا۔

اسلام آباد میں جامعہ سلفیہ کے لیے قطعہ زمین کے سلسلے میں ایک مرتبہ ضیاء الحق نے مولانا معین الدین کو اداکارے رات کے ڈیڑھ بجے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ متعلقہ سیکرٹری کو باقاعدہ حکم دے کر زمین مستقل طور سے جامعہ سلفیہ کے نام منتقل کر دی گئی ہے۔ اب اس میں کسی قسم کی گڑبڑ کا امکان نہیں رہا۔ یہ ٹیلی فون اس نے کسی غیر ملکی دورے پر روانہ ہونے سے تین گھنٹے پہلے کیا تھا۔ مولانا سے دعا کی درخواست بھی کی تھی۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دیں کہ پاکستان کے ہر حلقے میں مولانا معین الدین لکھوی کی بے پناہ پذیرائی ہوئی اور انھیں بہ درجہ غایت مستحق تکریم گردانا گیا۔

بہر حال معین الدین سے ہماری بے تکلفی رہی اور ان سے بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ اپنے علمی خاندان کی یہ آبرو ہیں اور ان کی خدمات گونا گوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ میں نے ان کی زندگی کا ہر دور دیکھا ہے، ہر پہلو سے ان کا جائزہ لیا ہے اور سفر و حضر میں انھیں خوب پرکھا ہے۔ میں اپنی معلومات کی روشنی میں انھیں مخاطب کر کے کہوں گا:

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں



۲۴ جولائی ۱۹۳۸ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تاسیس ہوئی تو یہ اس اجلاس میں موجود تھے۔ مولانا داود غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب کے زمانہ صدارت میں یہ مرکزی جمعیت کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے اور بعض کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں میں بھی انھیں رکھا گیا۔ اس کی نشان دہی میں اپنی کتاب ”لقوش عظمت رفتہ“ کے ان مضامین میں کر چکا ہوں جو مولانا سید محمد داود غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔

ایک مرتبہ میں کسی کام سے اسلام آباد گیا۔ اس وقت قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا اور مولانا معین الدین اسلام آباد میں تھے۔ میرا قیام راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں تھا۔ ایک دن شام کو معین الدین سے ملنے ایم این اے ہوٹل چلا گیا۔ کافی دیر ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ واپس آنے لگا تو کہا، کچھ دیر بیٹھو، کھانا کھا کر چلے جانا۔ میں کھانے کے لالچ میں بیٹھ گیا..... انھوں نے ایک شخص سے کہا جاؤ، دو تین پلیٹیں دال کی لاؤ۔

دال کا نام سن کر میں کھڑا ہو گیا اور عرض کیا، آپ دال کھائیے اور مجھے اجازت دیجیے۔ دال تو لاہور ہمارے گھر میں بھی مل جاتی ہے۔ اس کے لیے اتنی دور آنے اور ایم این اے سے ملنے کی کیا ضرورت تھی۔

بولے: یہاں کا گوشت اچھا نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا ذبیحہ بھی مشکوک ہے اور گوشت کے جانور بھی ایسے ہی ہیں۔ میں نے کہا: آپ یہ گوشت بالکل نہ کھائیے، لیکن ہمیں کیوں روکتے ہیں۔

فرمایا: لاہور بھائی اس کے لیے گوشت کی پلیٹ۔ کھانا کھا چکے تو برنی کا ڈبہ الماری سے نکالا۔ کہا یہ برنی ایک شخص دے گیا ہے۔ اس کے رنگ روپ سے بالکل پتا نہیں چلتا کہ یہ دودھ سے بنائی گئی ہے۔ میں نے وہ ڈبہ پکڑ کر کہا یہ ہمیں دیجیے اور آپ خالص دودھ کی بنی ہوئی کھائیے۔

ایک دن معین الدین سے ملنے کو جی چاہا تو میں لاہور سے اداکارے پہنچ گیا۔ وہ تعویذ لکھ رہے تھے اور ارد گرد ہجوم عاشقان تھا۔



## .....اور کہتی ہے

صبا کچھ اور کہتی ہے، فضا کچھ اور کہتی ہے  
چمن میں غنچہ و گل کی ہوا کچھ اور کہتی ہے  
ترا حُسنِ تلطُّف حاصلِ عُمُرِ اَلَم کیوں ہو  
تری چشمِ تغیرِ آشنا گچھ اور کہتی ہے  
سنجھل اے لغزشِ پا، جائزہ لے رنگِ محفل کا  
ٹھہر اے دل، کہ بنیادِ وفا کچھ اور کہتی ہے  
ہنرمندوں کو آخر کون دامن میں جگہ دے گا  
فقیہانِ سیاست کی ادا کچھ اور کہتی ہے  
حرم رُسا ہے، پیرانِ حرم سر در گریباں ہیں  
مگر اب گردشِ ارض و سما کچھ اور کہتی ہے

بقولِ حضرتِ اخترِ خدا رحمت کرے ان پر  
”کہ اس موسم میں دہلی کی فضا کچھ اور کہتی ہے“

(شورش کاشمیری)